

www.novelskidunya.com



بسمیل

از مہر النساء شاہ میر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ---

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ اَحِبَّابُ-----"

ناولز کی دنیا" کے ناولز میں خوش آمدید ---- "

ناولز کی دنیا" ویب سائٹ / گروپ / پیج دے رہا ہے تمام لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں آپ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے قلم سے تحریر کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں --- اگر آپ کو بھی اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے تو اسے اجاگر ضرور کریں --- ہمیں آپ جیسے ہی لکھاریوں کی تلاش اور ضرورت ہے ---

اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں -- اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ جتنا جلدی ہو سکا آپ کی تحریر پوسٹ ہو جائے گی ---

مزید تفصیلات یا کسی بھی طرح کی مدد کے لیے ہم سے گروپ یا پیج انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل پر ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں --

Email address :- Novelskiduniya77@gmail.com

Facebook page :- [Novels ki duniya](https://www.facebook.com/Novelski.duniya)

(user name [@zoyatalib77](https://www.facebook.com/@zoyatalib77))

Facebook group :- [Novels ki duniya](https://www.facebook.com/Novelski.duniya)

Instagram Page:- [Zoya Talib](https://www.instagram.com/ZoyaTalib) (UserName: [Novelskiduniya77](https://www.instagram.com/Novelskiduniya77))

Youtube Channel: Novels Ki Dunya (NKD) Official

(پر خیال رہے کہ یہ گروپ زویا طالب کا ہی ہو)

اور باقی کے رابطے کے لیے ہر پیج کے نیچے **Blue** الفاظ میں لکھے لفظ میں آپ کو لنکس مل جائے گے ان سب کے --

لکھا ہے ان دونوں کو وزٹ کرنے کے لیے لکھے ہوئے پر ہی کلک کریں اور اوپن کر لیں ---

شکریہ ----

بسمیل

از قلم: مہر النساء شاہ میر

"باب پنجم: انسان اور اسکا ماضی"

انسان اور اسکا ماضی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔

کئی باتیں، کئی لہجے ہیں، انسان اور اسکے ماضی کا عکس۔

وہ دور بیت چکا جب سیاہی تھی چھائی ہوئی۔

جب تم ہوئے تھے بے قدر، جب عقل تھی مرجھائی ہوئی۔

جب تم سے نچھڑے دوست کبھی، جب تم نے سہے درد کبھی۔

جب روٹھی خوشیاں، بکھرے تھے رازدار سب ہی۔

اک دن تھا پھر عین جوانی کا ، بچپن کا یا پھر عمر رسیدگی کا۔

تم تھے سامنے اپنے ، تم نے لیا عہد اپنی پزیرائی کا۔

پھر بیتے ماہ و سال کئی ، بیتا دور جگ ہنسائی کا۔

ایک رات سیاہ کو پھر تمہاری آنکھ کھلی۔

یوں لگا جیسے ماضی کی ہر الٹ چکی بساط کھلی۔

آئینہ ایک بار پھر تمہارے سامنے ہے ، ایک چہرہ ہے جو ماضی ہے۔

وہی چہرہ ہے جو حال بھی ہے۔ اب پوچھو کیا یہ پہیلی ہے۔

اے انسان کیا تم کو واقعی لگا تھا کوئی ماضی ہے۔؟

اور اگر ہے تو کیا وہ دے گا حافظہ تم کو بھلانے۔؟

تمہارا ہر عمل ہے مشروط تمہارے ماضی سے۔

ہر اگلا قدم تمہارا محفوظ ہے تمہارے ماضی سے۔

تم ہو ابھی بھی سہمے ہوئے بچے، تم ہو اب بھی جھٹلائے گئے سچے۔

تمہارے خوف ہیں اب بھی رازدار تمہارے۔

تمہارے زخم ہیں اب بھی نہ لگے مرہم کے مارے۔

تمہیں لگا تھا چھوٹ گئے اندیشے تمہارے۔

لیکن وہ اب بھی ہیں اندر تمہارے۔ نہ نہ نہ نہ۔

نہ ڈرو، نہ کھرچو زخم، نہ بیٹھو دبک کر۔

اچھا برا ماضی نہ تھا ہاتھ تمہارے، لیکن دو جہاں کا رب ہے ساتھ تمہارے۔

اس سہمی رات میں، دیکھو آئینے کی آنکھ میں۔

مٹاؤ خوف جو رہے ایک عرصہ ساتھ تمہارے۔

مسکراؤ، آنکھیں ملاؤ، سینہ تانو، کندھے اٹھاؤ۔

انسان اور اسکا ماضی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں دہراؤ۔

”تم یہاں کیا کر رہے ہو فضول انسان۔؟“

”سوال میرا بھی کچھ مختلف نہیں۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو عظیم عورت۔؟“

دو لوگ ایک دوسرے کے روبرو تھے۔ دو لوگ جو آگ اور پانی جیسے تھے۔ دو لوگ جنہوں نے اپنے ہونے سے، اپنی قدر و قیمت بڑھائی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ایسے دیکھ رہے تھے جسے کچا نکل لینا چاہتے ہوں۔ ان دونوں کی آنکھوں میں خون اترتا تھا، نفرت، سخت نفرت کرتے تھے وہ دونوں ایک دوسرے سے۔ یہ کوئی پیشہ ورانہ نفرت نہیں تھی۔ بھلا ایک فیشن ڈیزائنر ایک انٹیریئر ڈیزائنر سے ایسی نفرت کیوں کرے گا۔؟

یہ کوئی وقتی نفرت نہیں تھی۔ اُنہوں وقتی نفرت یوں آنکھوں میں نہیں اتر آتی۔ یہ کئی برس پرانی، بغض و عناد سے بھری، دل کے نہاں خانوں سے جھانکتی برہنہ نفرت تھی۔ جسکا اظہار برملا کیا جاتا تھا۔ گھڑی کی سوئیوں کو پیچھے موڑا، وقت کے پانی میں چند منٹ قبل کے چپو گھمائے، آس پاس چلتے ورکرز کے ہاتھوں سے کافی کے کپ چھین لئے، آرٹ بناتے ڈیزائنرز کے دماغ سے نیا نیا آئیڈیا مسخ کیا اور یوں اب ہم وقت میں چند منٹ پیچھے آگئے۔ طوفان کے پہلے کی خاموشی، آئیڈیا کے لئے دماغ پہ زور دیتے

ڈیزائنرز، اور کافی کے بھرے جانے والے مگ۔ ان سب کے درمیان بیز کلیکشن کی بلڈنگ کے باہر جھانک کر دیکھو تو اپنی لمبی گاڑی سے براق حنیف باہر آتا دکھائی دے گا۔

یہ قیس کے ساتھ موجود شوخ براق نہیں تھا، یہ مہدی کے سامنے بے وقوف بننے والا براق نہیں تھا۔ یہ بیز کلیکشن کا مالک قیس کا آدھا حصے دار (قیسم ٹیکسٹائل)، ملک کی سب سے بڑی ٹیکسٹائل انڈسٹری کا مالک تھا۔ اسکی چال میں غرور تھا، گردن اٹھا رکھی تھی۔ آنکھیں عقاب کی مانند چاروں اطراف میں دیکھ رہی تھیں۔ وہ خراماں خراماں چلتا بیز کلیکشن کی عمارت میں داخل ہوا۔ عمارت کا گراؤنڈ فلور آج روز کے حساب سے خالی تھا۔ وہ لفٹ میں سوار ہوا، اور مطلوبہ فلور کا بٹن دبایا۔ چند لمحے بعد وہ اپنے مطلوبہ فلور پہ تھا۔ لفٹ کے آہنی دروازے آپس میں جدا ہوئے، اسی پل وہ باہر آیا مگر سامنے سے آتی لڑکی کو دیکھ ایک لمحے کے لئے اسکا سانس جہاں تھا وہیں تھم گیا۔ براق حنیف پلک تک نہ جھپک سکا۔

سامنے سے شیزل سیمسن چلتی ہوئی آرہی تھی۔ سفید کرتا، نیلی جینز بالوں کی پونی ٹیل، گلے میں مفلر کی مانند لیا گلابی دوپٹہ، پیروں میں سفید ہیلز اور آج آنکھوں پہ چشمہ بھی لگا تھا۔ براق نے اسکے کندھے پہ ٹنگا بیگ دیکھا، ایک بے اختیار، شناسا مسکراہٹ اسکے لبوں پہ آئی۔ جیسے وہ جانتا تھا اس بیگ سے سب نکلے گا، سوائے ایٹم بم کے نسخے کے، سوائے اگلے وزیر اعظم کی تقرری کے کاغذات کے۔

اسی لمحے ایک احساس، ایک شناسا، بے یقین سے احساس کے تحت شیزل نے نظر اٹھا کر سامنے دیکھا، اور اسکی آنکھیں پتھرا گئیں۔ لمبی راہداری میں وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ دونوں انجان نہیں تھے۔ لوگ آس پاس سے گزر رہے تھے۔ شور، آواز قدموں کی چاپ سب کچھ مدھم ہوتا گیا۔ شیزل کئی سال پیچھے چلی گئی۔ اسکی آنکھوں کے سامنے براق تھا، لیکن اسے جو آواز آتی تھی وہ کئی سال قبل والے براق کی آواز تھی۔

”تم اور میں ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہیں براق، لیکن ہم دونوں نے کبھی ایک دوسرے کو گرایا نہیں، ہم دونوں ایک دوسرے کے رازوں سے واقف تھے لیکن ہم نے کبھی انہیں لوگوں پہ ظاہر نہیں کیا۔“ کالج کی راہ داری، نم آنکھیں، تنی ہوئی گردن، ابھری ہوئی نسیں۔ شیزل سیمسن اسکے سامنے کھڑی تھی۔

”ہم دونوں دشمن ہیں شیزل، دشمنی میں حدود نہیں ہوتیں، دشمنی میں پردے نہیں ہوتے۔ تم نے ایک کمزور لمحے کی زد میں مجھ پہ بھروسہ کر لیا اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ چشمے کے پار بھی وہ ان آنکھوں کا کرب دیکھ سکتا تھا، دشمن ہوتے ہوئے بھی وہ اس درد کو محسوس کر سکتا تھا۔ ”کیا کبھی کسی دور میں مجھے یہ کہنے کی ضرورت تھی کہ ہاں براق مجھے تم پہ اعتبار ہے۔ کیا راز بتاتے وقت کہنا ہوتا

ہے کہ انہیں آگے نہ بڑھایا جائے۔؟" وہ سوال کر رہی تھی کیونکہ اسے جواب چاہیے تھا۔ وہ تعلق توڑتے وقت یقین دہانی چاہتی ہے کہ اس تعلق میں کیا کیا سڑ چکا ہے۔ تاکہ مستقبل میں وہ آزاد رہے۔

براق نے کچھ کہنے کو لب کھولے لیکن حال کی شیزل نے لبوں کو سختی سے میچ کر، آنکھوں کو بند کر کے کھولا تو کالج کے درخت، ٹھنڈی ہوا اور جھلسا دینے والا سچ سب غائب ہو گیا۔ اس کے سامنے کھڑا شخص اب غیر اہم تھا۔ اس نے اپنے بیگ کو کندھے پہ درست کیا، گردن کڑالی، اور آگے بڑھنے لگی۔ اسکے لب دھیرے دھیرے بڑبڑا رہے تھے۔

”تمہیں تمہارے اعصاب پہ قابو ہے شیزل۔“ وہ اس آدمی کے سامنے چلتی آ رہی تھی، وہ کبھی دوست نہیں رہا تھا، وہ جس کے ساتھ ہمیشہ نفرت رہی، لیکن ویسا تعلق بھی کبھی کسی اور کے ساتھ بھی نہ رہا تھا۔

”تمہارے جذبات تم پہ حاوی نہیں ہو سکتے۔ انکی اتنی جرات۔؟“

لوگوں کی آواز، راہ داری میں خود پہ پڑتی براق کی یک ٹک نظر، ماضی میں ملے دھوکے وہ سب نظر انداز کر رہی تھی۔ براق اب بھی بے سانس ہوتے جسم کے ساتھ کھڑا تھا۔

”تمہیں تمہارے اعصاب پہ قابو ہے۔“ اور وہ اسکے سامنے سے گزر گئی، دل اتنی زور سے دھڑکا تھا کہ حد نہیں۔ آنکھیں نم نہ ہوئیں، لیکن اسکے دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی۔ براق برق رفتاری سے اسکے پیچھے گیا۔ لفٹ بند ہونے والی تھی جب اس نے اپنے بوٹ کو بیچ میں پھنسا دیا۔ دروازے کے پٹ جدا ہوئے، شیزل اسے یوں نظر انداز کر رہی تھی جیسے جانتی ہی نہ ہو۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو شیزل۔؟“ لفٹ کے پٹ بند ہوئے تو وہ بے قراری سے اسکے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ اس نے جواب نہ دیا بس نظر انداز کئے کھڑی رہی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو شیزل۔؟“ اس نے اب کے سختی سے پوچھا۔

”میں یہاں کام کرنے آئی تھی۔ لیکن اب نہیں کروں گی۔“ وہ خود کو نارمل رکھے گی جہاں تک جتنا بھی ہو سکتا تھا وہ خود کو نارمل رکھے گی۔

”تمہیں لگتا ہے، تمہاری اتنی اوقات اور قابلیت ہے کہ تم یہاں کام کرو۔ تم یہاں کیا کر رہی ہو صاف صاف بتاؤ۔“

”فضول انسان تم یہاں کیا کر رہے ہو۔؟“ وہ غرائی۔

”سوال میرا بھی کچھ مختلف نہیں ہے تم یہاں کیا کر رہی ہو عظیم عورت۔؟“ وہ عظیم عورت کہہ رہا تھا ، لیکن اسکا انداز گھٹیا سے بھی گھٹیا تھا۔ شیزل اس وقت کوئی ڈرامہ افورڈ نہیں کر سکتی تھی ، سولفٹ میں خاموشی سے کھڑی رہی ، ایسے جیسے سانس نے اسکے جسم کو چھوا بھی نہ ہو گا کبھی۔

”یہ میرا آفس ہے۔“ براق عین اسکے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ شیزل کو بے اختیار کوفت ہوئی۔ ”تم یہاں کام کرنے کو اپنا خواب سمجھنا ، بلکہ ویٹ لیٹ می گیس۔ تم جہاں بھی رہتی ہو ، وہاں کے اگلے سو کلو میٹرز کی جانچ رکھتی ہو کیا تمہیں معلوم نہیں تھا یہ میرا آفس ہے۔“ وہ آنکھیں اسکے اوپر گاڑے ہوئے تھا ۔ ”تم یہاں مجھے دیکھنے تو آئی نہیں ہو گی۔ صاف صاف بتاؤ یہاں آنے کا تمہارا مقصد کیا ہے۔؟“ وہ دھیمی آواز میں غرا رہا تھا۔

شیزل نے ٹھنڈی پر سکون نظروں سے اسے دیکھا ، گو کہ دل میں آگ کے بھٹے جل رہے تھے ، لیکن وہ توازن نہیں کھوئے گی۔

”تم میرے باپ نہیں ہو براق حنیف ، میں تو اپنے باپ کو بھی جوابدہ نہیں ہوں۔“ غصے سے اسکی آواز دھیمی تھی۔ لفٹ اپنی مخصوص آواز سے کھلی ، شیزل نے اپنے قدم باہر کی جانب موڑے جب براق نے

سرخ ہوتے چہرے کے ساتھ اسکا بازو پکڑ کر دوبارہ اندر کی جانب کھینچا، لفٹ کے بٹن دبائے، لفٹ دوبارہ چل پڑی، لمحوں کا کھیل تھا اور شیزل اس لمحے کو پراسیس نہ کر سکی۔ وہ شل رہ گئی۔

”مجھے بے وقوف مت بناؤ، میں پاگل نہیں ہوں شیزل۔ تم یہاں اتفاقاً نہیں آ سکتی۔ مجھے یہ کہانی مت سنانا کہ تمہارا یہاں آنا اتفاق ہے، اور میرا یہاں کا باس ہونا تمہارے علم میں نہیں۔“ وہ اسکے بازو کو اب بھی اپنی آہنی گرفت میں لئے ہوئے تھا۔

شیزل نے ایک ہاتھ سے اسکے سینے پہ دھکا دیا اور دوسرے ہاتھ کو ایک جھٹکے سے چھڑایا۔ ”میں یہاں کام کرنے آئی ہوں براق حنیف۔ تمہارا یہاں کا باس ہونا تو چھوڑو یہاں کے گارڈ اور خاکروب تک کا علم ہے مجھے۔ میرا یہاں آنا کسی قسم کا اتفاق نہیں۔ میری موجودگی میرا پروفیشن ہے۔“

”اگر تم اتنی ہی پروفیشنل ہو تو مجھے یہاں دیکھ کر تم بھاگ کیوں رہی تھیں۔؟“

”کس نے کہا میں بھاگ رہی تھی، کس نے کہا میں تمہیں نظر انداز کر رہی تھی۔ میرا کام خلی منزل پہ ہے میں اپنا کام کرنے جا رہی تھی۔“ لفٹ ایک بار پھر کھلی، براق اب کے خاموش سلگتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کئی ورکرز لفٹ میں سوار ہوئے شیزل اس پہ ایک بے زار نگاہ ڈالتے ہوئے باہر نکل

آئی، ابھی لفٹ کے دروازے بند ہوتے کہ براق نے ورکرز کی موجودگی کو نظر انداز کرتے ہوئے اسے پکارا۔

”جب مجھ سے اتنی نفرت ہے تو پھر یہاں کام کرنے کی وجہ۔“ شیزل ہیل کے بل گھومی آنکھیں پٹپٹا کر اسے دیکھا۔ اسکی آنکھیں بیک وقت سنجیدہ اور سفاک تھیں۔

”کس نے کہا مجھے تم سے نفرت ہے براق حنیف۔؟“ اور یہاں اس جواب پہ براق نے اپنے دل کو خالی ہوتا محسوس کیا، دوستی، اعتبار، نفرت کچھ نہیں تھا۔ ان کے درمیان۔ چاہے نفرت ہی سہی کوئی جذبہ تو ہوتا۔

لفٹ کے جامد دروازے حرکت میں آئے اور ان دونوں کے چہرے اس لوہے کے گیٹ میں کہیں دور کھو گئے۔ وقت کی طرح، ریت کی طرح۔ لیکن دل میں اٹھتی ٹیس آہ کوئی اس کا کچھ کرے۔

☆☆☆☆☆☆

قیس کمبیر کی گاڑی قیسم کو جانے والے راستے پہ دوڑ رہی تھی۔ لیکن آج وہ اکیلا نہیں تھا۔ اسکے ساتھ گاڑی کی پچھلی نشست پہ اسکا بھائی نما کزن، اسکا جگری دوست مہدی کمبیر بیٹھا تھا۔ قیس گاڑی سے باہر

دیکھ رہا تھا، جبکہ مہدی کو رہ رہ کر یونیورسٹی کا وہ منظر یاد آتا تھا، جہاں زینیا نے اس آدمی کے ہاتھ پکڑے تھے۔ شادی، تعلق، پارٹنر شپ اس معاملے میں وہ ایک بار پھر الجھ گیا تھا۔ زینیا وہ لڑکی تھی، جس نے ہمیشہ مہدی کا بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکا تھا، پھر بھلا اس آدمی پہ اتنی مہربان کیوں۔؟ اسے زینیا سے کسی قسم کا لو انٹرسٹ نہیں تھا۔ بس اسکی شادی مہدی کے لئے مسٹری بن گئی تھی۔

”سنو نائٹ میسر۔؟ شادی کیا ہے۔؟“ اس نے بلاخر اسے مخاطب کر لیا۔

”جھک، جو کبھی انسان اپنی مرضی سے مارتا ہے۔ کبھی گھر والوں کی۔“ کیا جواب تھا ماشاء اللہ۔

”کیا تم نے کوئی ایسی عورت دیکھی ہے، جو بالکل پتھر کی طرح سخت ہو لیکن کسی ایک مرد کے لئے نرم پڑ جائے۔“

”ساری عورتیں ایک نمبر کی ڈرامہ باز ہوتی ہیں۔ اپنی پسند کے مرد کے لئے فوراً نرم پڑ جاتی ہیں۔ عورتیں

آخر پیدا کیوں ہوئیں۔ آہ عجیب مخلوق؟“ وہ آخر میں بڑبڑایا۔ مہدی جو کہ الجھا ہوا تھا، ایسے عظیم جوابات

پہ مزید الجھ گیا۔

”شادی کیوں کرنی چاہئے۔؟“

”جسے خود کو ذلیل، کروانے کا شوق ہو اسے ضرور کرنی چاہیے۔“ اعلیٰ جواب۔

”کیا ساری شادیاں ایک وقت کے بعد گل سڑ جاتی ہیں۔؟“

”ہاں۔ اور کچھ شادیاں اتنی گلی سڑی ہوتی ہیں کہ انہیں چھپا کر رکھا جاتا ہے، تم نے کبھی وہ پھل دیکھا ہے جو ایک جانب سے سڑا ہوا ہو۔؟ سڑے ہوئے پھل کا دوسرا حصہ دنیا کو دکھایا جاتا ہے تاکہ وہ خریدا جاسکے۔ شادی بھی دنیا کی وہی پالیسی ہے۔ سڑا ہوا حصہ چھپا کر، لوگوں کو وہ دکھانا جو سچ ہے، نہ جھوٹ۔“

”تمہیں کیا لگتا ہے انسان کو شادی کیوں کرنی چاہیے۔“

”کر لینی چاہیے اچھی رہی تو زندگی سنور جائے گی، ورنہ سبق مل جائے گا۔“ مہدی کی باتیں بے کار تھیں۔ ہاں وہ باہر دیکھتا رہے گا زبردست۔

”کیا انسان اتنا بے کار ہے خود کو تجربے میں ضائع کر دے۔“ اب کے قیس نے اسے مڑ کر دیکھا۔

”کیا تم شادی کر رہے ہو۔؟“ وہ از حد سنجیدہ تھا۔ مہدی نے نفی میں سر ہلایا۔ ”لیکن مجھے جاننا ہے شادی

کیا ہوتی ہے۔۔“

"کچھ نہیں ہوتی، جھک ہوتی ہے۔" وہ بڑے سکون سے دہرا رہا تھا۔ مہدی کے چہرے پہ بے سکونی بڑھتی چلی گئی۔ قیس سکون سے کھڑکی سے باہر دیکھتا رہا۔ اسی لمحے گاڑی قیس کی عمارت کے سامنے آ کر رکی۔ قیس نے کھڑکی سے باہر دیکھا، اور پھر مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔ قیس اسکا جنون تھا۔

کئی لمحے بعد وہ دونوں راہداریوں میں چلتے نظر آ رہے تھے، پھر لفٹ اور پھر بلاخر قیس کسبیر کا گلاس وال والا آفس۔ پاور چیئر کو گلاس وال کے قریب رکھے، وہ گہری نظروں سے مہدی کو دیکھ رہا تھا۔ مہدی اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھا تھا۔ بازو پہ اب بھی پلستر چڑھا تھا۔

"میں تم سے کچھ باتیں پوچھنا چاہتا ہوں مہدی اور جواب اگر سچ کے علاوہ کچھ ہوا تو تم مجھے جانتے ہو۔"

"شاید اس آدمی کو دھمکی کے علاوہ کچھ آتا نہیں تھا۔"

"میں نے گھر کے ایک ایک ملازم کی چمڑی ادھیڑی ہے، سی سی ٹی وی چیک کئے ہیں، جو کہ چند لمحوں کے لئے بند ہوئے تھے۔ آس پاس کے گھروں کی فوٹیج دیکھی ہے لیکن کسبیر محل میں سوائے تمہارے ان دوستوں کے کوئی اور داخل نہیں ہوا۔ یعنی تمہارا پیچھا کرنے والا تمہارے دوستوں میں سے کوئی ایک ہے۔" وہ ایک پل کو رکا۔ مہدی سنجیدگی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”لیکن تمہارے سارے دوست ممی ڈیڈی بچے ہیں۔ گن چلانا تو دور اسکا خواب و خیال بھی انکے لئے خوف کا باعث ہے۔ اس لئے ان میں سے کوئی تمہیں شوٹ نہیں کر سکتا، کسی کے پاس وجہ ہی نہیں ہے۔ اور سی سی ٹی وی میں تمہارے سارے دوست کہیں گئے ہی نہیں، سو وہ سب بری الذمہ ٹھہرے۔“ وہ ذرا دیر کو خاموش ہوا تو مہدی نے ٹوکا۔

”جی جاسوس قیس کمبیر صاحب آگے عرض کریں، میرے گناہوں میں مزید کیا کیا شامل کرنا ہے۔“ اسکا چہرہ مارے ہتک کے سرخ پڑ رہا تھا۔

”تو بات یہ ہے مہدی کمبیر کہ میرے ملازم وفادار ہیں۔ سی سی ٹی وی کسی غیر کے کہنے پہ بند نہیں کیا گیا۔ تمہارے دوست سی سی ٹی وی کی موجودگی میں داخل ہوئے، حملہ آور کیسے آیا۔ جانتے ہو کیسے۔“ وہ اب پاور چیئر سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ مہدی کی اور قدم بڑھاتے ہوئے وہ سفاک لگتا تھا۔

”بات یہ ہے مہدی کمبیر کہ حملہ آور کو گھر میں لانے والے تم تھے۔“ مہدی جہاں تھا وہیں تھم گیا۔

”تم ڈرامہ کر رہے ہو مہدی کہ کوئی تمہارے پیچھے آتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارا ساتھی ہے۔ جسے تم سی سی ٹی وی بند کروا کر اپنے گھر لاتے ہو، جو راہداریوں میں چلتے ہوئے سیدھا تمہارے ہی کمرے

میں آتا ہے، جو تین گولیاں تمہارے بازو پہ ضرور مارتا ہے لیکن ایک گولی تمہارے دل کے مقام پہ مار کر تمہارا کام ختم نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ تمہیں مارنا ہی نہیں چاہتا۔ "مہدی کو سانس لینے میں دقت سی ہوئی۔

"تم وکٹم بن رہے ہو، حالانکہ تم ولن ہو۔ میں تمہارا اصل چہرہ دنیا کے سامنے لے آؤں گا۔ میں دنیا کو

دکھاؤں گا، قیس کے guesses کبھی غلط نہیں ہوتے۔ کہہ دو مہدی کہ تم ولن نہیں ہو۔؟"

مہدی چند لمحہ اسے دیکھتا رہا، اسکی رنگت سفید پڑ چکی تھی۔ آنکھیں نیم مردہ سی نظر آ رہی تھیں۔

"فرض کرو اگر میں نے ایسا کچھ کیا بھی ہے، تو اسکی وجہ کیا ہوگی۔؟"

قیس نے ہتھیلی کا مکا بنا کر صوفے پہ دے مارا۔ "وہی تو، وہی تو سمجھ نہیں آرہا آخر وجہ کیا ہے۔ اگر شہرت تو میرا نہیں خیال تمہیں اسکی ضرورت ہے، پیسہ تمہارے پاس بہت ہے، لڑکی کا معاملہ ہو نہیں سکتا۔

"you're not that type"

یکدم وہ چکر کاٹتے کاٹتے رکا تھا۔ "ماضی تمہارا ماضی۔ تم اپنے ماضی کو کور اپ کر رہے ہو، تم نے کچھ کیا ہے مہدی، جسے اب تم چھپانا چاہتے ہو۔ تم اس وقت کہانی کے وکٹم ہو لیکن کوئی دور ایسا

رہا ہو گا جب تم کہانی کے ولن تھے، تم ولن تھے ناں مہدی۔؟" وہ اپنے اندازوں کی تصدیق چاہتا تھا۔
مہدی چند پل سانس روکے اسے دیکھے گیا، اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"میں ولن لگتا ہوں، لیکن میں کہانی کا وکٹم ہوں۔" چبا چبا کے بس یہی الفاظ ادا کئے اور پھر لمبے لمبے
ڈگ بھرتا آفس سے باہر نکل گیا۔

قیس نے سر جھٹکا تھا۔ "مر نہ جاتے خوشی سے گر اعتبار ہوتا۔"

قیسم کی لمبی راہداریوں میں چپکے سے دبے پاؤں داخل ہو تو مہدی کمبیر تمھیں ایک پیغام لکھتا نظر آئے
گا۔ "میں اس کھیل سے تھک چکا ہوں۔ میں حقیقت بتانے کو تیار ہوں، ہاں میرا ماضی سیاہ تھا۔ کیا تم
میری سیاہ کاری سننے کو تیار ہو۔؟"

الفاظ حیران و پریشان، کچھ کچھ پشیمان سے اپنے مطلوبہ شخص کی طرف جا رہے تھے۔ کہانی کا وکٹم ولن
بن رہا تھا۔ کھیل اب شروع ہو رہا ہے۔ کیا تم تیار ہو۔؟

☆☆☆☆☆☆☆☆

اسلام آباد کی شامیں کافی بوجھل اور خاموش ہوا کرتی ہیں۔ اس کے بوجھل پن کو کم کرنے کے لئے گاڑھی چائے کا ایک کپ، بالکنی سے نظر آتا کوئی خوبصورت نظارہ، جھلملاتی روشنیوں کا آنکھ میں ٹھہر جانا، یا پھر کڑوی کافی کا ایک مگ بس یہی بس یہی کافی ہوتا ہے۔ یونہی اسی بوجھل ہوتی شام میں اسلام آباد کے ایک رنگین کیفے کا رخ کرو تو زرد بتیوں نے سارے میں خوابناک سا ماحول پیدا کر رکھا تھا۔ آفس سے تھکے ہارے لوگ، پارٹنر اور دوست سے ملاقات کرتے لوگ، کافی یا پھر چائے سے اپنی تھکن اتارتے لوگ اس کیفے میں بہت تھے۔ لیکن دو لوگ تھے، جن کے پاس کافی سے زیادہ بڑے مسائل تھے۔ جن کی تھکن کم از کم یہ کڑوا مائع نہیں اتار سکتا تھا۔ انکی تھکن ابدی تھی۔ کیا تم ان دو لوگوں کے بارے میں مزید جاننا چاہو گے۔؟

چہرے کا رخ موڑ کر، آنکھوں کو ایک مختلف زاویے پہ گھما کر دیکھو تو کیفے کی درمیانی میز کے گرد زینیا حاکم اور بالاج میر بیٹھے تھے۔ بالاج کا سر جھکا تھا۔ وہ از حد پشیمان تھا۔ زینیا سنجیدہ تھی، نہ وہ پریشان تھی، نہ مایوس وہ حل ڈھونڈے بیٹھی تھی۔ لیکن مسائل کی تہہ تک جانا اسکا فرض تھا۔

”مجھے سب سچ جاننا ہے بالاج۔ مجھ بتائیں کیا ہوا، کیسے ہوا، کب ہوا۔“ اس نے بازو سینے پہ باندھ رکھے تھے۔ آنکھیں سچ جاننا چاہتی تھیں۔ بالاج نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ اسکی آنکھیں سرخ تھیں۔ مایوس، پریشان۔

”سعودی عرب میں میرا ایک دوست رہتا ہے۔ ہم دونوں ساتھ پڑھتے تھے۔“ اس نے کہنا شروع کیا۔

اس کے بھائی کا سعودی عرب میں بہت اچھا کاروبار تھا، اور وہ ہمیشہ مجھ سے کہتا رہتا تھا کہ اگر میں کچھ سرمایہ اکٹھا کر لوں تو وہ اپنے بھائی سے میرے لئے بات کرے گا اور مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لے گا۔ میں نے اسکی بات پہ غور کیا اور مجھے پتہ چلا کہ جن بلندیوں کی، جن آسائشات کی مجھے ضرورت ہے، وہ مجھے چند ٹکے کی نوکری میں نہیں مل سکتیں۔ نہ ہی کسی پاکستانی کاروبار میں جہاں آدھے خاندان کو مجھے پالنا پڑ رہا ہو۔ مجھے پیسہ وہاں کمانا تھا، جہاں بس مجھے معلوم ہو کہ میں کتنا کما رہا ہوں۔ ”وہ سانس لینے کو رکا۔ اپنی بیوی کو ایک نظر دیکھا۔ اسے لگا تھا وہ اسے سچ بتا دے گا تو زینیا کے دل سے ہر بات نکل جائے گی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ زینیا حاکم باتیں یاد رکھ لیتی ہے، تاکہ آپ کی ایک امیج بنا سکے، پھر اس میں خود کو فٹ کرے، جو ظلم آپ نے کسی اور پہ کیا، زینیا اسے خود پہ تصور کرے، اور پھر ساری زندگی آپ کو اسی بات کا طعنہ دیتی رہے۔ جی ہاں ایسی تھی زینیا حاکم۔

”میں نے اپنی پڑھائی کے سالوں میں مختلف جابز کیں۔ تم تو جانتی ہو ہمارا حصہ جو ہمیں دادا کی طرف سے ملا تھا وہ سارے کا سارا ابا کے جوا، اور شراب کی نظر ہو گیا۔ اماں کا حصہ وہ جہیز کی صورت لے چکی تھیں۔“ (زینیا کہنا چاہتی تھی کہ جہیز حصہ نہیں، لیکن یہ وقت مختلف تھا۔) ”میں نے بہت محنت کی زینیا، دن رات گدھوں کی طرح کام کیا، اپنی پڑھائی کے ساتھ ساتھ میں نے کئی کورسز کئے، پیسہ جمع کیا۔ اور پھر بلاخر میرے پاس پانچ لاکھ جمع ہو چکے تھے۔“ ویٹر نے بالاج کے سامنے کافی کاگ رکھا، زینیا نے۔۔، ”ایک چائے“ کہہ کر اسکی لائی کافی کو منع کیا۔ مختصر وقفے کے بعد وہ پھر کہہ رہا تھا۔

”چند سالوں میں میرے پاس اچھی خاصی رقم جمع ہو چکی تھی۔ اور پھر چند ماہ پہلے جب تمہارے ابا ہمارے رشتے کی بات چلانا چاہتے تھے تب انہوں نے مجھے کاروبار، یا کسی نوکری کے لئے دس لاکھ دینے چاہے۔“ بالاج ایک پل کو رکا، زینیا کی بے تاثر آنکھوں میں دیکھا اور پھر میز پہ دھرا اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ ”میرا یقین کرو زینی تم سے شادی کی وجہ وہ رقم نہیں تھی۔“ اسکی آنکھیں کہتی تھیں وہ سچ کہہ رہا ہے۔

”تم سے شادی میری دل کی خواہش تھی، میں نے جب سے ہوش سنبھالا یہی خواہش کی تھی۔“

”آپ نے باقی کے پیسے کیسے پورے کئے۔؟“ وہ اپنے مطلب کی بات پہ آئی۔ بالاج نے گہری سانس لی۔

”کچھ سیونگنز، کچھ ادھار، اور تمہارے ابا کے دیئے دس لاکھ۔ میرے پاس تیس لاکھ تھے۔ میں خوش تھا۔ جس رات ہماری شادی تھی، اسی رات میری فلائٹ بھی تھی۔ میرے ساتھ میرا ایک اور دوست بھی جا رہا تھا، جس کے پاس بیس لاکھ تھے۔ ہم کراچی ایئر پورٹ کی طرف جا رہے تھے، اس نے مجھ سے میرے پیسوں کے بارے میں پوچھا میں نے بتا دیا، اور پھر مجھے یاد ہے میں نے پانی پیا تھا۔ اسکے بعد سے مجھے کچھ یاد نہیں ہے۔ میں اگر یاد کرنا بھی چاہوں تو کچھ دماغ میں نہیں آتا۔ ان لوگوں نے مجھے دھوکہ دیا۔ میرے سارے پیسے لے کر بھاگ گئے۔“ اس نے ایک بار پھر سر جھکا دیا، اور بے حد دلگرفتگی سے کہنے لگا۔

”میرا سب کچھ تباہ برباد ہو گیا زینی میرے پاس اب کچھ بھی نہیں رہا۔ آئی ایم سوری زینی . آئی ایم سوری . . . میں نے تمہارے پیسے، میرے پیسے، میں نے سب برباد کر دیا۔ سب ختم ہو گیا ہے۔“ وہ اگلے کئی منٹ یونہی سر جھکائے پشیمان رہا۔ خود کو الزام دیتا ہوا، خود کو کوستا ہوا۔ زینیا چاہ کر بھی اسکی چارہ جوئی نہ کر سکی۔ دل میں اس آدمی کے لئے کوئی احساس تھا ہی نہیں۔ وہ پوچھ نہ سکی کہ بالاج کو کس نے حق دیا کہ وہ اس کے جہیز کے پیسے یوں خرچ کرے۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا بالاج۔ فکر مت کریں۔ میں حل نکال لوں گی۔“ بلاخر وہ ایک مشینی انداز میں کہہ چکی، بالاج نے جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اسکی گیلی آنکھیں ممنون تھیں۔

”مجھے معاف کر دو زینبی میں نے تمہارے ساتھ بہت غلط کیا ہے۔ ہماری شادی کو ابھی ایک ماہ بھی نہیں ہوا، اور میں نے تمہارے لئے اتنی ساری مصیبتیں کھڑی کر دیں۔“ وہ رکا، ایک خوف زدہ سی نظر زینیا کے چہرے پہ ڈالی۔

”کیا تم مجھے معاف کر سکتی ہو زینیا۔؟“ وہ یونہی چند لمحہ اسے دیکھتی رہی۔ اس شخص سے جو تعلق تھا وہ دنیا کا سب سے مضبوط رشتہ تھا۔ لیکن یہی وہ رشتہ تھا جس سے زینیا کو کوئی امید کوئی خواہش نہیں تھی۔ کیا وہ ساری زندگی خواہش کرنے سے گھبرائے گی، امید رکھنے سے ہچکچائے گی۔؟

”ہمارا مسئلہ ہے بالاج ہم مل کر فکس کر لیں گے۔ مجھ سے معافی مت مانگیں میں معاف نہیں کرتی۔“ زینیا حاکم نے خواہش کو چن لیا تھا۔ بالاج کے کندھوں سے ڈھیر سارا بوجھ سرکنے لگا۔

کینے سے اٹھ کر وہ دونوں اب ہاسٹل کے راستے پہ تھے۔ بالاج اب کمپوزڈ تھا۔ اگر آپ کے ساتھ کھڑے لوگ مشکل میں کندھے مضبوط کر لیں، تو آپ کا جسم خود ہی توانا ہو جاتا ہے۔

”آپ کہاں رہ رہے ہیں۔۔؟ یعنی کوئی مستقل پتہ۔؟“ فٹ پاتھ پہ قدم رکھتے ہوئے، چلتی گاڑیوں کے بے تحاشا شور کے درمیان زینیا نے بے حد سکون سے پوچھا۔

”میں ٹیکسلا میں اپنے دوست کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ تین لوگ کمرہ شیئر کر رہے ہیں۔ اب تو لگتا ہے ساری زندگی اسی جہنم میں گزر جائے گی۔“ اس نے بے زاری سے سر جھٹکا۔

”جہنم، جنت کا فیصلہ تو انسان اپنے اعمال اور کوششوں سے طے کرتا ہے۔ آپ مایوس کیوں ہو رہے ہیں۔؟“ وہ دونوں اب ہاسٹل کی لمبی گلی کا موڑ مڑ رہے تھے۔

وہ ساتھ چلتے ہوئے گردن موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”تم اتنی پازیٹو کیسے رہ لیتی ہو۔؟“

”نیگیٹیویٹی اپنے ساتھ مسائل لاتی ہے۔ اور میرے پاس مسائل سے پہلے حل آتے ہیں۔ ہماری زیادہ بنتی ہے ویسے۔ آئے دن کا ٹاکرہ جو ہے۔ ویسے اگر میں آپ کو پازیٹو لگتی ہوں، تو آپ کی زندگی کی سب سے بڑی غلطی ہے۔“ بالاج ہنس پڑا، زینیا اس کے ساتھ ہنسی تھی۔

”کیا تم نیگیٹو ہو۔؟“

”اُونہوں میں over thinker ہوں۔ میں چیزوں کو آسانی سے بھول نہیں سکتی۔ چاہے کوئی کہانی ہو، واقعہ ہو، حادثہ ہو۔“

”یا پھر کوئی انسان ہو۔؟“ بالاج نے اسکی بات اچک لی۔ دونوں جانتے تھے یہ انسان کون تھا۔ زینیا نے برا نہیں منایا۔

”ہاں میں انسانوں کو بھی نہیں بھولتی۔ مجھے سب یاد رہتا ہے، اور میں اسے مسلسل سوچتی رہتی ہوں۔ ایک غیر حقیقی دنیا بنا لیتی ہوں، جہاں کبھی خوش ہوتی ہوں، اور کبھی مسائل زدہ۔“

بالاج نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا۔ وہ دونوں اب ہاسٹل کے گیٹ کے سامنے تھے۔ زینیا یہاں تین مردوں کے ساتھ آئی تھی، گئی تھی۔ اس نے دو مردوں کو سرخ جھنڈی دکھائی تھی، انکے اور اپنے گرد ایک حدود بنالی تھی۔ یہ آدمی، یہ مختلف تھا۔

”کیا تم انسانوں کو سوچنا چھوڑ نہیں سکتیں زینیا۔“ وہ اسکی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”میں over thinker شوق سے نہیں ہوں۔ یہ میری مجبوری ہے۔ لیکن۔۔“ وہ دو قدم آگے آئی
عین بالاج کے سامنے۔ ”میں اس انسان کی سوچوں پہ بے حس ہو چکی ہوں۔ اور آپ کی سوچیں، مجھ میں
احساس واپس لا رہی ہیں۔“ بالاج تھم گیا۔ بالکل ساکت۔

”میں اس رشتے کو لے کر سیریس ہوں بالاج۔ اور تھنکرز کے ساتھ گزارا مشکل ہے، نا ممکن تو نہیں
۔“ وہ جیسے احساس دلا رہی تھی۔ کچھ جتا رہی تھی۔ بالاج ہلکا پھلکا ہو گیا۔

”ایک لٹے ہوئے، ناکام کاروباری، جاب لیس، اور خالی جیب والے مرد کے ساتھ گزارہ مشکل ہے نا
ممکن نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تو زینیا مسکرائی۔ بالاج بھی دھیرے سے مسکرا دیا۔ ماضی کو ایک طرف
رکھ کر دو لوگ آگے بڑھ رہے تھے۔

خدشوں سے دور، فکروں سے پاک، ناکامیوں سے فاصلہ کناں ایک روشن مستقبل کی اور۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

گوادر زینیا حاکم کے بعد سونا سونا ہو گیا تھا۔ حاکم نواب کا گھر اب کونج کو کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔
کھانا، کپڑے، دوست، شاعری، وہ سب کچھ زینیا ہی کے ساتھ تو بانٹتی تھی۔ اب وہی نہیں تھی تو کیا کیا

جائے۔؟ رات کو اکیلے کمرے میں اسے ڈر لگتا تھا، کالج میں ہونے والے نئے واقعے اس نے دل میں دبا رکھے تھے۔ لیکن آخر کب تک۔؟ وہ بے حد حساس لڑکی آج تھک گئی تھی اور گھر کے پچھلے صحن میں بیٹھ کر اب بری طرح رو رہی تھی۔ منہ پہ ہاتھ رکھے ہچکیاں اس نے روک رکھی تھیں، لیکن پھر بھی اسکے سسکنے کی آواز کافی بلند تھی۔ یہی آواز سنتے ہوئے گھر کے اندر کی طرف جاتی ہوئی نبیلہ باجی نے ہول کر اپنے دل کے مقام پہ ہاتھ رکھا تھا، اور پھر فوراً سے پیشتر ادھر کا رخ کیا۔ کونج کو منہ چھپائے روتے دیکھ وہ فوراً اسکے قریب چلی آئیں۔

”آئے ہائے کیا ہو گیا۔؟“ وہ سینے پہ ہاتھ رکھتی اسکے ساتھ چارپائی پہ بیٹھ گئیں۔ ”اے باؤلی ہو گئی ہے کیا۔؟ ارے کچھ منہ سے بول بھی بس روئے جا رہی ہے۔؟“ کونج مزید بلند آواز میں رونے لگی تو نبیلہ باجی نے اسے خود سے لپٹا لیا۔ ”کیا ہو گیا ہے کونج مجھے بھی نہیں بتائے گی۔؟ دیکھ مجھے اپنی دوست ہی سمجھ اور بتا دے کیا ہوا ہے۔۔؟“ انہوں نے کونج کے آنسو صاف کئے لیکن وہ اب بھی مکمل طور پہ پر سکون نہ ہوئی تھی۔

”بس کر کوچ ایسے نہیں روتے بچے۔ مجھے بتا ہوا کیا ہے۔ میں ہوں ناں میں دوست ہوں تیری۔ دیکھ میرے منہ سے بھاپ بھی نہیں نکلے گی بتا کیا ہوا ہے۔“ وہ اسے پچکار رہی تھیں۔ کوچ نے بھیگی آنکھیں ہتھیلی کی پشت سے صاف کیں۔

”مجھے زینبی یاد آتی ہے۔ مجھے اسکی بہت یاد آتی ہے۔“ اس کے آنسو ایک بار پھر روانی سے بہنے لگے تھے۔ ”اس نے مجھے چھوڑ دیا ہے، وہ میری کالز وقت پہ نہیں اٹھاتی۔ میری پڑھائی متاثر ہو رہی ہے۔ زینبی بس اپنا سوچتی ہے۔“ وہ یونہی جذبات میں گلہ کر بیٹھی۔ نبیلہ باجی ہنوز اسے سینے سے لگائے بیٹھی تھیں۔ ہولے ہولے اسکا سر بھی تھپک رہی تھیں۔ کافی ساری باتیں، گلہ کر لینے کے بعد بلاخر اسکا دل ہلکا ہو چکا تھا۔ نبیلہ باجی نے اسے نرمی خود سے الگ کیا۔

”دیکھ کوچ زینبیا اب اپنے گھر بار والی عورت ہے۔ اب اسکا بھرا پورا سسرال ہے، شوہر ہے، اسکی پڑھائی کے بھی جھمیلے ہیں۔ وہ اب تجھے ویسا وقت، ویسی توانائی نہیں دے سکے گی۔ حالانکہ وہ چاہتی ہوگی، لیکن پھر بھی اب یہ سب اس کے لئے ممکن نہیں ہے۔ تم سمجھ رہی ہو۔“ انہوں نے ٹھہر کر تصدیق چاہی، کوچ نے بے اختیار گردن اثبات میں ہلا دی۔

”لیکن تو خود کو اکیلا کیوں سمجھ رہی ہے۔؟ ضیغم ہے ناں۔“

”خدا کا خوف کریں بھلا اس سے میرا کیا واسطہ۔“ کونج نے بے اختیار خوف کھایا تھا۔ نبیلہ باجی سر پیٹ کر رہ گئیں۔

”سارے واسطے اسی سے تو ہیں۔ پاگل لڑکی کیا تیرے اماں باوا باؤلے (پاگل) تھے، جو تیری منگنی زینیا کی شادی کے عین وقت پہ کروا دی۔؟“ کونج انہیں دیکھتی رہ گئی۔

”ماں باپ اولاد کو جانتے ہیں۔ اب تمہارے اماں ابا کو معلوم تھا کہ زینیا کے بعد تو اکیلی ہو جائے گی۔ دل کی بات کہنے کو، اپنی سنانے کو زینیا تو ہوگی نہیں۔ جب ہی تمہاری منگنی ضیغم سے کروا دی، تاکہ کوئی ساتھی ہو جو دکھ سکھ بانٹے۔ بات کرے، دل بہلائے۔“

”لیکن ضیغم میرا منگیتر ہے شوہر نہیں۔ اس سے بات کرنا گناہ ہے۔“ کونج نے ایک بار پھر انکی بات کاٹی تھی۔

”آج کے زمانے میں شوہر منگیتر کچھ نہیں ہوتا، جو مرد آپ کے ساتھ منسوب ہے اسکی لگامیں کھینچ کر رکھو۔ دیکھ کونج کچھ لڑکیوں کے پاس، عقل سمجھ ہوتی ہے اور انکے مرد انکے قابو میں رہتے ہیں۔ تو انکے

جیسی نہیں ہے۔ کچھ لڑکیاں خوبصورت ہوتی ہیں اور پھر انکے مرد انکے قابو میں رہتے ہیں۔ تیرے پاس دونوں نہیں ہیں۔ "سفاکی کی حدوں کو چھونا کیا ہوتا ہے کوئی اس عورت سے سیکھے۔ کونج اپنی جگہ سہم سی گئی۔

"میں نے نوٹ کیا تھا شادی پہ بھی اس نے ایک بار تجھ سے بات نہیں کی، رک کر تیری تعریف نہیں کی۔ ارے منگیترا کا کچھ تو حق ادا کرتا وہ۔ پہلے مجھے لگا، اسے تجھ میں کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔ لیکن معاملہ اب مجھے سمجھ آیا ہے۔"

"کیوں نہیں دیکھتا وہ مجھے۔؟" کونج نے خود کو کہتے سنا۔

"کیونکہ وہ تجھ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اسکا رنگ، قد کاٹھ، اسکی ذہانت آدھے خاندان کی لڑکیاں اسکے آگے پیچھے منڈلاتی ہیں۔ ایسے میں وہ مغرور ہو گیا ہے۔ ایسے مرد چاہتے ہیں کہ انکی طرف پہل کی جائے اور اب جب تک تمہاری جانب سے پہل نہیں ہوگی وہ تمہارا نہیں ہو سکتا لکھوا لو۔ اسکو قابو میں کر لے کونج۔ خاندان میں ایک عبداللہ کافی تھا، اب دوسرا مت لا۔ وہ چھوڑ دے گا تو کیا کرے گی تو۔؟"

"وہ مجھے نہیں چھوڑ سکتا۔..... ضیغم ایسا نہیں لگتا۔"

”اپنی اس کزن وریشہ کو دیکھا تھا کیسے اسکے آگے پیچھے گھوم رہی تھی۔؟ مرد برا نہیں ہوتا، یہ کمبخت تیسری عورت اسے اچھا رہنے نہیں دیتی۔ مرد کو قابو کر کے رکھنا ہوتا ہے، ورنہ وہ دسترس سے نکلنے میں دیر نہیں کرتا۔“ کونج رونا بھول عجیب محضے میں پھنس گئی تھی۔

”وہ کوئی پرندہ نہیں ہے جسے میں قید کر دوں۔ اور کیا میں اتنی بے مول ہوں جو یوں اسکے پیچھے بھاگوں۔“ نبیلہ باجی نے اسے افسوس سے دیکھا تھا۔

”مرد کو ہمیشہ پرستش چاہیے ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے اس سے وابستہ عورت اسکے آگے، پیچھے رہے۔ ساری توجہ، سارا مرکز بس وہی رہے۔ بڑی ضدی، اور بچکانہ مخلوق ہیں مرد۔ یہ جتنا بھی نہیں چاہتے، اور پھر یہ ضد رکھتے ہیں کہ عورت بس ان سے جڑ کر رہے۔ کچھ مردوں کے لئے پہلا قدم آپ کو خود اٹھانا ہوتا ہے۔ ضیغم کے لئے پہلا قدم تمہیں لینا ہو گا۔ ورنہ خاندان ایک اور عبداللہ دیکھے گا۔ اور یاد رکھنا، ہر زینیا کے لئے بالاج نہیں آتا۔“

وہ بول چکیں تو خاموش ہو گئیں۔ کونج چپ چاپ بیٹھی رہ گئی۔ جن بچوں نے بری شادیاں دیکھی ہوں، وہ اچھی شادی کے خواب دیکھتے ہیں۔ جن بچوں نے گھر میں تشدد دیکھا ہو، مار پیٹ گالم گلوچ دیکھی ہو وہ

باہر امن اور سکون کی خاطر people pleaser بن جاتے ہیں۔ جن بچوں نے تنگدستی، معاشی بد حالی دیکھی ہو وہ بڑے ہو کر اونچا گھر، اچھا کھانا چاہتے ہیں۔ انسان کا مستقبل اسکے ماضی سے جڑا ہوتا ہے۔ انسان کے اختیار میں ہوتا ہے کہ برے ماضی کو اچھے حال سے بدل لے، یا پھر حال کو ماضی سے بھی بدتر کر دے۔ تمہارے خیال میں کونج حاکم کیا کرے گی۔؟

☆☆☆☆☆

قسم کے ورکرز آج دھڑا دھڑا ڈیزائنز چھاپ رہے تھے۔ کافی کے بھاپ اڑاتے گزر آج ہر ڈیزائنر کے ہاتھ میں نظر آتے تھے۔ بی قیو پراجیکٹ کے ڈیزائن جلد آن ایئر ہونے تھے۔ پری بکنگ شروع ہونے میں بس کچھ دن باقی تھے۔ تقریباً ہر ڈیزائنر اپنے ڈیزائن کو ایک آخری ٹچ دیتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن یہاں ایک ایسا ڈیزائنر تھا جس سے اب تک کام نہیں ہو پا رہا تھا۔ اسکے ہاتھ جامد تھے، دماغ آئیڈیاز سے بھرا ہوا مگر سن۔ کچھ تھا جو پچھلے کئی ماہ سے اسے کوئی ڈیزائن بنانے نہیں دے رہا تھا۔ آرٹسٹ کا درد کاش کوئی سمجھ سکے۔

اپنے آفس میں گلاس وال کے سامنے رکھے صوفے کے آگے اس نے ایک چھوٹی میز رکھی ہوئی تھی۔
 آس پاس اسکیچ پنسلز، رنگ، ٹیبلٹ، کاغذ اسکیچ بک اور کئی مڑے مڑے کاغذ پڑے تھے۔ اسکے
 گھنگھریالے بال آج ماتھے پہ بکھرے تھے۔ آنکھیں بے تحاشا سرخ تھیں۔ اسی لمحے اسکے آفس کا دروازہ
 ایک دھاڑ سے کھلا براق حنیف چہرے پہ غیض و غضب لئے اندر آتا دکھائی دیا۔
 ”میں اس لڑکی کو اپنے ہاتھوں سے ماروں گا۔“

(”اسکا قتل جس دن ہوا میرے ہاتھوں سے ہو گا۔“ کیفے کے پر سکون گوشے میں بیٹھی شیزل قطعاً پر
 سکون نہیں لگتی تھی۔ اس وقت اسکا چہرہ غصے سے بھرا تھا۔ نسیم ابھر آئی تھیں۔

وہ وائس ایپ پہ وائس نوٹ ریکارڈ کرتی، اپنی دوست کو آج کے rants بھیج رہی تھی۔ ہر دو منٹ بعد
 وہ طنز و تمسخر سے اپنی بات بتاتے ہوئے رک جاتی اور ”لائک واؤ، لائک سیریلی۔؟“ جیسے جملوں کا
 اضافہ کرتی تھی۔ بیز کلکیشن کے دفتر سے نکلنے کے بعد وہ سیدھا یہاں آئی تھی۔ اسے اپنا غصہ پراسیس
 کرنا تھا۔ وہ اگر بولتی نہ تو پھٹ پڑتی۔)

”کسے قتل کرنے نکلے ہو تم سنگل پسلی۔؟“ قیس نے گردن صوفے پہ گرا دی۔ براق سرخ دہکتے ہوئے چہرے کے ساتھ آگے آیا اور گلاس وال کے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا۔

”شیزل سیمسن واپس آ چکی ہے۔“ اس نے چبا چبا کر اطلاع دی۔ قیس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔

”کیا مطلب وہ واپس آ گئی ہے۔ وہ گئی کہاں تھی۔؟“ وہ محظوظ ہوا۔ ”وہ تو روز اول سے وہاں ہے۔“ (اس

نے براق کے دل کی جانب اشارہ کیا۔) ”اور وہاں بھی۔“ (اب کے براق کے دماغ کی جانب اشارہ کیا۔)

”بکو مت لوسفر۔ میں سیریس ہوں۔ وہ آج میرے آفس آئی تھی۔ اس نے میرے سامنے کھڑے ہو کہا

کہ وہ مجھ سے نفرت نہیں کرتی۔ وہ ایسا کیسے کہہ سکتی ہے۔“

”تمہیں اعتراض کس بات پہ ہے؟۔ اسکے یہ کہنے پہ کہ اسے تم سے نفرت نہیں ہے۔ یا پھر یہی بات

تمہارے سامنے کھڑے ہو کر کہنے پہ۔؟“ اس نے بازو سینے پہ باندھے آنکھیں محظوظ کن انداز میں براق

کے چہرے پہ گاڑ رکھی تھیں۔

براق نے ضبط کرنے کی کوشش کی۔ ”جو کچھ بھی ماضی میں ہوا تھا، اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔“ کمال

ڈھٹائی تھی۔

”جو کچھ بھی ماضی میں ہوا اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ میں ایک پھر کی ہوئی لڑکی تھی، شاید میں نے اسے وہ سب بتاتے ہوئے بھانگ پی لی تھی۔ میں اتنی پاگل کیسے ہو سکتی ہوں۔؟“ اس نے وائس نوٹ ریکارڈ کرتے ہوئے حیرت کا مظاہرہ کیا۔ پھر بے زاری سے فون کو میز پہ دھر دیا۔ اور میز پہ رکھے کیک کا ایک بڑا سا ٹکڑا اٹھا کر منہ میں ڈالا۔

اسے کھانا چاہیے تھا۔ ڈھیر سارا کھانا۔ مشکل، مسائل، پریشانی انکے حل کے بعد اسے بس کھانا ہی چاہیے ہوتا تھا۔ کیک کا ایک بڑا سا ٹکڑا کھا لینے کے بعد اس نے موبائل اٹھایا۔ کھلی ہوئی چیٹ میں اب اسکی دوست کے میسجز چمک رہے تھے۔ وہ اسے سمجھا رہی تھی، شاید کالم ڈاؤن ہونے کو کہہ رہی تھی۔ لیکن شیزل فیصلہ کر چکی تھی۔

”میں کل صبح اپنا استعفیٰ اسکے منہ پہ مار کر آؤں گی۔“

”میں کل صبح اسے آدھے آفس کے سامنے فائر کروں گا۔ سمجھتی کیا ہے خود کو۔؟“ وہ غصے سے بڑبڑایا۔

ساتھ آگے بڑھ کر میز پہ دھری کافی کا گ اٹھا لیا، اور ایک ہی گھونٹ میں اپنا حلق جلا لیا۔

”تم اسے فائر کرو یا نہ کرو، وہ خود کل صبح استغفی تمہارے منہ پہ جوتے کی طرح مارے گی۔ آہ کاش میں وہ منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا۔“ اسے تاسف ہوا۔

”تم میرے دوست ہو یا پھر اس کے۔؟“ وہ دبا دبا غرایا۔

”میں تو سچائی کا علمبردار ہوں۔ جو کچھ تم نے اس کے ساتھ کیا تھا، وہ انتہائی نازیبا تھا۔“

”تمہارے جیسے دوستوں پہ لکھا گیا ہے۔ 'مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ'۔“

”اور تمہارے جیسے دشمنوں پہ لکھا گیا ہے۔ دشمن کم عقل ہو مگر کم نسل نہ ہو۔“ براق اب کے یہاں سے وہاں چکر لگانے لگا تھا۔ اسے کسی پل چین نہ آتا تھا۔

”اسے اپنے آفس میں رکھنے کی ایک وجہ بتاؤ مجھے۔“ بلاخر وہ رک گیا۔ خود کو ایک توجیہ دینی چاہی۔

”وہ ٹیلنٹڈ ہے، اپنے کام کو جانتی ہے۔ اور پروفیشنل ہے۔ اور اگر کوئی اور وجہ نہ ملے تو اسے اپنے دل

کی ملکہ سمجھ کر رکھ لو۔“

”(جواب چھوڑنے کی ایک وجہ بتاؤ مجھے۔ سوائے اس کے کہ وہ تمہارا دشمن رہ چکا ہے۔“ شیزل کی دوست

کا دس سیکنڈ کا وائس نوٹ اسے الجھن میں ڈال گیا۔

”وہ کمینہ ہے۔ ذلیل ہے۔ اور غیر پروفیشنل ہے۔“ ایک ہاتھ میں کیک کا ٹکڑا اٹھائے۔ منہ کو اسی کیک سے بھرے وہ پھنسی پھنسی آواز میں بولی۔

”پہلی دو وجوہات انتہائی فضول ہیں۔ اور تیسری کا کوئی ثبوت نہیں۔ کیونکہ اب تک تم نے اس کے ساتھ کام نہیں کیا۔“ اب کے شیزل کو غصہ آیا تھا۔ سخت غصہ۔ اسکی یہ دوست ہر دفع یہی کرتی تھی۔ اس کا ساتھ دینے کی بجائے اسے کریکٹ کرنے لگ جاتی تھی۔

”تمہاری کوئی دلیل کوئی بات میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ میں کل صبح استعفیٰ اسکے منہ پہ ماروں گی۔“

”تمہاری کوئی دلیل، کوئی بات میرا فیصلہ نہیں بدل سکتی۔ میں کل صبح ٹرینیشن لیٹر اسکے منہ پہ ماروں گا۔“ اس نے آخری فیصلہ کر لیا تھا۔

”اور جب وہ اسکے بدلے میں تمہارا سر دسویں دفع پھاڑے گی تب مجھے ویڈیو کال کر لینا، یقین مانو زندگی میں پہلی بار تمہیں دیکھ کر خوشی ہوگی۔“

براق نے دانت پہ دانت جما کر اسے دیکھا۔ پھر اپنا موبائل نکال کر ایک کال ملائی۔ ”ہاں شاکرہ میرے لئے ایک ہائیڈرائے فیشنل کا اپائنٹ لو، آج ایک بہت بڑے جراثیم سے واسطہ پڑ گیا ہے۔“ قیس نے

مسکرا کے سر کو خم دیا۔ جیسے تعریف وصول کی ہو۔ پھر اپنا موبائل نکالا۔ حدیبیہ کو کال ملائی۔ اور براق کو اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو ”اب میری باری۔“

”حبیب میرے لئے ایک کافی کاگ لاؤ، اور یہ پچھلا والا ڈسپوز کر دینا۔ کسی کتے نے منہ مار لیا ہے۔“ یہ وار زیادہ کاری تھا۔ براق تمللاتا ہوا کافی کاگ فرش نشین کرتا باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے دروازہ ایک دھاڑ سے مارنا نہیں بھولا۔ اس کے دن تو گئے جا چکے۔ اس نے سرگوشی کی۔ اور دوبارہ اپنے کام پہ جھک گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کبیر محل کی اسٹڈی میں آج ایک الگ ماحول تھا۔ کتابوں کے ریک کے آگے صوفہ رکھے مہدی کبیر آج ایک ویڈیو شوٹ کرنے لگا تھا۔ سامنے کیمرہ سیٹ تھا۔ میز پہ چائے کاگ اور تھرماس رکھا تھا۔ یہ آدمی چائے کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ کیمرہ سیٹ کر کے وہ سامنے آ کر بیٹھا۔ سیاہ بیگی شرٹ میں، کارگو پینٹ پہنے گلے میں لٹکتا لاکٹ۔ وہ کیمرہ پرفیکٹ تھا۔ سانولی رنگت آج کھلی کھلی تھی۔

”ہر دفع ویڈیو شروع کرنے سے پہلے میں آپ سب کو موضوع گفتگو بنالیتا ہوں۔ زہر تو لگتا ہوں گا۔؟“ وہ چائے کا کاگ ہاتھ میں لئے کہنے لگا تھا۔ ”کچھ واقعات جن پہ میں بات کرتا ہوں آپ کا ان سے

کبھی کوئی تعلق نہیں رہا ہوتا، لیکن پھر بھی میں کہتا ہوں۔ آپ نے دیکھا ہوگا، آپ اس سے گزر چکے ہیں۔ جانتے ہیں میں ایسا کیوں کہتا ہوں۔؟“

”جب تک میں آپ کو اپنے موضوع میں شامل نہیں کروں گا تب تک آپ کو یہی لگے گا کہ یہ کسی تیسرے شخص کی بات ہو رہی ہے۔ لیکن جو نہیں میں آپ کو مخاطب کروں گا تب آپ میری بات میں انوالو ہو جائیں گے۔“ اس نے چائے کا گھونٹ بھرا پھر رکا۔ ”کہاں ملے گا میرا جیسا آدمی۔؟ وہ جو اپنے بھید بھی کھول دیتا ہے۔؟“ ذرا دیر کو کیمرے میں دیکھتا رہا پھر ”آگے بات کرتے ہیں۔ آج کا موضوع ہے انسان کا ماضی۔ ہمارا پاسٹ۔ آپ کے، میرے اور میری بات سنتے تمام لوگوں کے ماضی میں کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ہوگا جو بھلانے کے قابل نہیں ہے۔ جسے یاد کر کے آج بھی ہمارے زخم تازہ ہو جاتے ہیں۔

ماضی کو کبھی بھی کھرچ کر نہیں نکالا جاسکتا، ماضی سے لڑا نہیں جاسکتا، مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، ماضی کو بھلایا نہیں جاسکتا۔ آپ جانتے ہیں آپ خوش کیوں نہیں ہیں۔؟ کیونکہ آپ غلط کوشش میں ہیں۔ آپ ماضی کو بھلانا چاہتے ہیں۔ جو کہ ناممکن ہے۔ آپ کو نئے تعلق میں پرانا تعلق نظر آتا ہے، جب نئے دوستوں کے ساتھ انہی جگہوں پہ جاتے ہیں جہاں کبھی پرانے دوستوں کے ساتھ گئے تھے تو یوں لگتا

ہے جیسے خود کو دھوکہ دے رہے ہوں۔ ان دوستوں، یا پھر پارٹنر کو دھوکہ دے رہے ہوں۔ کیا ایسا نہیں ہے۔۔؟“ وہ اب صوفے پہ آلتی پالتی مارے بیٹھ گیا۔ گود میں کشن رکھ لیا۔

”انسان اپنی میموری نہیں بھلا سکتا۔ انسان ان واقعات کو نہیں بھول سکتا جو اس کے ساتھ ہوئے تھے۔ پھر آپ اپنے ساتھ ظالم کیوں بن رہے ہیں۔؟ خود کو ایذا دینا، خود کو ٹینشن دیئے رکھنا کیا یہ اپنے ساتھ ظلم نہیں ہے۔؟ ہاں آپ کو پرانا پارٹنر یاد آئے گا کیونکہ آپ نے اس کے ساتھ ایک عرصہ گزارا ہے۔ آپ کو چھوڑے ہوئے دوست یاد آئیں گے، کیونکہ وہ آپ کی زندگی میں "تھے"۔ آپ کا موو آن، آپ کی سیلف ریسپیکٹ یہ ہے کہ آپ اس کے پاس واپس جانے کا نہ سوچیں۔ اگر اس نے آپ کے ساتھ برا رویہ رکھا تھا، اس غم سے نکل کر موجودہ وقت میں خوش رہیں۔“ اس نے رک کر چائے کا گھونٹ لینا چاہا مگر مگ خالی ہو چکا تھا آگے بڑھ کر مگ کو بھرا۔ تھرماں سے نکلتی چائے کی دھار، دبیز کتابوں کی خوشبو، اور مہدی کمبیر کا نرم لہجہ۔ کیا زندگی تمہارے ساتھ اتنی مہربان بھی رہی ہے۔؟

”ماضی میں آپ کے پیرنٹس، بہن بھائی، دوست یا رشتے داروں کا رویہ آپ کے ساتھ برا رہا ہوگا۔ آپ کے برے تعلیمی ریکارڈ کی وجہ سے، آپ کے کردار کی خرابی کی وجہ سے، یا پھر اور بھی کئی قسم کے مسائل۔ لیکن اس وقت آپ ایک اچھی پوزیشن میں ہیں۔ وہی رشتے دار، دوست، ماں باپ اب آپ کی

عزت کرتے ہیں۔ لیکن آپ ماضی نہیں بھول پاتے۔ آپ کو لگتا ہے یہ سب دھوکہ ہے اور آپ تمام لوگوں سے بد ظن ہو کر خود کو تنہا کئے بیٹھے ہیں یہ غلط ہے انتہائی غلط۔

آپ ان لوگوں کے ساتھ چاہے ایک پرفیکٹ لائف نہ گزاریں، مگر آپ ان کے ساتھ ایک نارمل زندگی تو گزار سکتے ہیں ناں۔؟ لوگوں پہ انویسٹ کرنا ہمیشہ فائدہ مند ہی ہوتا ہے۔ کبھی آپ کو صلہ مل جاتا ہے اور کبھی سبق۔ ماضی کی ٹوٹی دوستیوں، تعلقات کو چاہے مت جوڑیں مگر یوں خود کو تکلیف کیوں دینی۔؟ موو آن کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ آپ کو ماضی میں ہوئے واقعات سرے سے بھول جائیں گے۔ موو آن کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اپنے دل سے ان لوگوں کی عزت نکال دی جو آپ کی عزت نہیں کرتے، آپ نے ساری ساری رات ان لوگوں کو اسٹاک کرنا چھوڑ دیا جنہوں نے آپ کو تکلیف دی تھی، آپ نے کسی اور سبجیکٹ میں داخلہ لینا چاہا، کوئی اور نوکری کرنی چاہی، کہیں اور شادی کرنی چاہی نہ ہو سکی اب آپ کا موو آن یہ ہے کہ آپ جہاں ہیں وہاں خوشی تلاش کریں۔ خوش نہیں رہ سکتے تو کوئی بات نہیں خوشی اور غم کے بیچ میں بھی بہت کچھ ہوتا ہے۔ آپ "نارمل" رہ سکتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے رکا۔ بھنویں سکیڑ کر کیمرے میں دیکھا۔

”ہر کلاس میں کچھ ٹاپرز ہوتے ہیں کچھ فیلیئرز۔ لیکن ہر کلاس میں کچھ ”مڈل بینچرز“ بھی ہوتے ہیں۔ نہ آپ ٹاپر بن سکے تو آپ فیلیئر بھی نہیں بنیں گے۔ ویسے آپس کی بات ہے کامیابی کے جو جھنڈے مڈل بینچرز گاڑتے ہیں وہ کسی نے نہیں گاڑے۔“ ساتھ ہی وہ ہلکا سا مسکرایا تھا۔ مہدی کی فیملی فینز اس کے مسکرانے کی دعائیں کرتی ہوں گی۔

”ہر انسان کا ماضی برا نہیں ہوتا ہم میں سے کچھ لوگ ہیں جن کا ماضی شاندار تھا۔ ہمارے پیرنٹس ہمارے ساتھ اچھے تھے، بہن بھائیوں کے ساتھ پیارا بانڈ تھا۔ دوست بھی اچھے تھے۔ لیکن ہم کہیں دور آ گئے، یا پھر وہ ہم سے کہیں دور چلے گئے۔“ مہدی کے گلے میں گٹھی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔ حلق میں کانٹے سے چھنے لگے۔ اسے شدت سے اس کے ماں باپ یاد آئے تھے۔

”اچھا ماضی اب گزر چکا۔ زندگی میں انسان کو وہ سب نہیں ملتا جس کی اسے خواہش ہو۔ کچھ چیزیں، انسان طے ہوتے ہیں ان کا آپ کی زندگی میں آنا اور چلے جانا طے ہوتا ہے۔ غم اور خوشی ایک مدت تک کی ہوتی ہے۔ کوئی بھی چیز اگر اعتدال سے نکل جائے تو وبال بن جاتی ہے چاہے خوشی ہو چاہے غم۔ آپ جانتے ہیں سروائیور کون ہوتا ہے۔؟ ہمیں ہمیشہ سے بتایا گیا سروائیور وہ ہوتا ہے جو برے حالات سے صحیح سلامت نکل آئے۔ ہمیں غلط بتایا گیا۔“ یقیناً یہاں کئی لوگوں کی سانسیں رکی ہوں گی۔ مہدی کہتا رہا۔

”میں نے ایک بار ایک فلم دیکھی تھی۔ ایک آدمی دو پہاڑیوں کے درمیان پھنس جاتا ہے۔ اور پھر نکل نہیں پاتا۔ اس کا ایک بازو پہاڑیوں کے درمیان پھنس جاتا ہے۔ اتنی بری طرح کہ اسے نکالنا ناممکنات میں سے ہوتا ہے۔ کئی دنوں کی کوشش، محنت، بھوک پیاس۔ لیکن وہ انسان تھکتا نہیں ہے۔ کچھ دن بعد جب اسے یقین آجاتا ہے کہ یہاں سے وہ صحیح سلامت نہیں نکل سکتا۔ یا تو مر جائے یا پھر نکل جائے۔ یہ ایک کڑا وقت تھا وہ آدمی وہاں مر سکتا تھا مگر وہ سروائیور تھا۔ اس آدمی نے اپنے ہاتھوں سے اپنا بازو کاٹ دیا۔ کوئی اپنے جسم کو کیسے کاٹ سکتا ہے۔؟ کیا کوئی کاٹ سکتا ہے۔؟ یہ ایک انتہائی مشکل عمل ہے۔ مگر سروائیورز کے لئے یہی عمل زندگی ہے۔ اس آدمی نے اپنی بقیہ زندگی اسی ایک بازو کے ساتھ گزاری ہوگی۔ مگر اسکی ٹانگیں سلامت رہیں۔ اس کا چہرہ اسکی زندگی سلامت رہی کیا یہ کافی نہیں تھا؟ وہ بھوک پیاس، موت ہر چیز سے بچ کر نکل آیا تھا۔ صحیح سلامت نہیں ایک عضو گنوا کر مگر وہ آیا۔“ چند لمحے مہدی خاموش ہو گیا۔ گویا اپنی ہی بات پر اسیس کرنا چاہتا ہو۔

”ماضی بھی اسی طرح کا ہوتا ہے کئی بار آپ ڈٹبج ہو جاتے ہیں، کئی بار آپ کو اپنے سے وہ رشتے دور کرنے پڑتے ہیں جو جسم جیسے ہوں۔ آپ کبھی دل کٹوا کر آتے ہیں، کبھی روح لیکن آپ واپس آتے ہیں حال میں کیونکہ آپ سروائیور ہیں۔ اس آدمی نے اپنے ہاتھ سے اپنے بازو کی رگیں کاٹیں، آدھا بازو لے

کر لٹکتے ہوئے گوشت کے ساتھ واپس زندگی کی اور آیا کیونکہ وہ سروائیور تھا۔ ڈیج تھا مگر زندہ بھی۔ آپ کا ماضی بھی اسی طرح کا ہے ساری زندگی اس کٹے ہوئے بازو کی طرح ساتھ رہے گا۔ آپ نامکمل بھی رہیں گے۔ مگر آپ زندہ ہیں تو خود پہ جینے کی تمنا ترک نہیں کرنی۔ انسان اور اس کا ماضی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں بس فرق یہ ہے کہ آپ کو اس ماضی اور حال کے درمیان ایک باؤنڈری بنانی آنی چاہیے۔

ایک بہتر مستقبل کے عزم کے ساتھ مہدی کمبیر کو الوداع۔“ اس نے بیٹھے بیٹھے ہاتھ سینے پہ رکھا، اور سر کو ہلکا سا جھکایا۔ ویڈیو بند ہو گئی تھی اب وہ اپنا سامان سمیٹ رہا تھا۔ دبیز کتابیں اس کے پڑھائے سبق یاد کرتی رہیں۔

☆☆☆☆☆☆

ہاسٹل آج آکورڈ سی خاموشی میں ڈوبا تھا۔ زینیا حاکم بالاج سے مل کر آنے کے بعد اب افروزہ بیگم کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ وہی سیاہ لباس، چنری والا دوپٹہ، چہرہ زخم زدہ اور گردن کھڑی۔

اسکے دائیں طرف والے صوفے پہ شیزل سیمسن بیٹھی تھی۔ صبح والے لباس میں، بالوں کو گول مول باندھے، ایک ہاتھ میں کافی کا مگ، جسکا اسٹرا اسکے لبوں تک جاتا تھا۔ اور دوسرے ہاتھ میں کوئی انگریزی

ناول تھا۔ چشمے کے پار شاطر آنکھیں کبھی زینیا کو دیکھتیں، کبھی افروزہ بیگم کو۔ شیزل کو مسائل پسند تھے۔ مسائل اسکے دماغ کو تیز رکھتے تھے۔ اور اسکے اندر کی sadist soul کو مطمئن۔ نارمل اور پرسکون دن اسے غیر نارمل لگتے تھے۔

”تم اپنی صفائی میں خود کچھ کہنا چاہو گی، یا پھر میں اپنی طرف سے سوال کروں۔؟“ وہ سنجیدہ تھیں۔ اور سخت بھی۔ زینیا گہری سانس لیتے ہوئے آگے کو ہوئی۔

”آئی . . . میں اس وقت ٹراما ٹائیز تھی۔ میں اس آدمی کو جانتی تک نہیں تھی، پھر میں اسے کیسے اپنے بارے میں سب سچ بتا دیتی۔ وہ آدمی ایک رات قبل مجھے پارک میں ملا تھا، اس نے میری گردن پہ بندوق رکھی، اس نے مجھے مارنے کی کوشش کی وہ بھی صرف ایک فکشنل کردار کے لئے۔ کیا آپ یقین کر سکتی ہیں . . . میں . . .“

”اے تھو انتہائی بے کار . . .“ زینیا کی بات کے درمیان میں ہی شیزل منہ بگاڑ کر بولی۔ اسکی کافی کا ذائقہ اچھا نہیں تھا۔ دو سنجیدہ عورتیں اب اس غیر سنجیدہ عورت نما بلا کو دیکھ رہی تھیں۔ شیزل نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھا کر گویا سرینڈر کیا ہو۔

”میں آپ کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی۔ میں اس مسئلے کو اسی طرح فکس کرنا چاہتی تھی جس سے آپ کو کوئی مسئلہ نہ ہو، لیکن آئی ایم سوری مجھ سے یہ نہیں ہو سکا۔“ اس نے شاید زندگی میں پہلی بار سوری کہا تھا۔ ”میں آپ سے ریکویسٹ کر رہی ہوں کہ پلیز آپ میرے گھر والوں سے اس بارے میں بات نہ کریں۔ میں“

”یہ کیا بکواس ڈیڑھ ہزار کی لی تھی یہ کتاب، ایسے کیسے مرکزی کردار کو مار دیا۔“ ریڈنگ گلاسز والی لڑکی ایک بار پھر انکی گفتگو میں مغل ہوئی تھی۔ اب کے آنٹی اور زینیا نے ایک قہر آلود نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ شیزل نے اپنی آنکھیں پینڈولم کی طرح یہاں سے وہاں گھمائیں، جیسے کہہ رہی ہو۔

Why so offended?

اور پھر دوبارہ گردن کتاب پہ جھکالی۔ آنٹی کی فیورٹ نہ ہوتی تو اس وقت زینیا اسکا گلا دبا چکی ہوتی۔ کاش وہ یہ کر سکتی اے کاش۔

”دیکھو زینیا میں نہیں جانتی تم اس ڈرگزر کے بیگ کو لے کر اتنی جذباتی کیوں ہو گئی تھیں، میں نہیں جانتی کہ تم اگر مہدی کسیر پہ یقین کر سکتی ہو تو اسکے بھائی قیس کسیر پہ کیوں نہیں۔“ زینیا کو چار

سو والٹ کا کرنٹ لگا تھا۔ اس آدمی کا نام قیس کمبیر تھا۔؟ اوہ خدایا وہ مہدی کا کزن تھا۔؟ یعنی وہ محل، وہ پر تعیش جنت نما گھر مہدی کمبیر کا تھا۔ اور اسکا کزن وہ ایک دوسرے سے اتنے مختلف۔؟ بے یقینی سے اسکے لب ہلکے سے وارہ گئے۔

”میں یہاں رہنے والی ہر لڑکی کی ذمہ دار ہوں۔ یعنی کہ میں تمہاری بھی ذمہ دار ہوں۔ جو کچھ تم نے کیا ہے اسکے بعد میں تمہیں یہاں رکھ نہیں سکتی۔ کل صبح تم یہاں سے جا سکتی ہو۔ میں تمہارے گھر والوں کو کال نہیں کروں گی، لیکن میں چاہوں گی کہ تم خود انہیں کال کر لو۔“ وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔ زینیا بس انہیں دیکھتی رہی، شیزل اب جلدی جلدی آخری صفحات پڑھ رہی تھی، ڈیڑھ ہزار ضائع ہوئے تو وہ اس انسٹاگرام رائیٹر کو ڈیڑھ سو گالیاں دے کے آئے گی۔

”آپ جانتی ہیں خوبصورت، با اعتماد، زہین، اور خود شناس ہونا کتنا بڑا جرم ہے۔؟“ زینیا کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھی، اب وہ دونوں سنجیدہ عورتیں ایک دوسرے کو دیکھ رہی تھیں۔ آمنے سامنے، ایک دوسرے کے روبرو۔ غیر سنجیدہ عورت نے بھی اب کے سر اٹھا لیا تھا۔ کتاب بور لگی تھی۔

”میں نے اپنی کلاس میں جب قدم رکھا، تب وہاں مجھ سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں تھیں۔ لیکن کوئی بھی دنیا حاکم نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا مجھ پہ نظریں ہیں، لیکن میں بے نیاز تھی جیسے مجھے فرق ہی نہ پڑتا ہو۔ میں کسی اور کو دیکھ کر دل میں چور خانے نہیں بنا سکتی تھی۔ اسی لئے میں نے کلاس میٹ اپ میں جھوٹ کہا کہ میری شادی پسند کی تھی۔ کیا غلط کیا۔“

”بلکل نہیں تم نے صحیح کیا، بلکہ مجھے بتاؤ تمہیں دیکھ کون رہا تھا آنکھیں نکال کر لے آؤں گی۔“ ایک ہاتھ میں کتاب، ایک ہاتھ میں کافی، اور جوش سے بلند آواز۔ شیزل سیمسن ایک بار پھر سین میں اپنی جگہ بنا چکی تھی۔ اسکی طرف کسی نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

”جب کلاس کے اس کوئیز میں جسکا نوٹس تک میرے پاس نہیں تھا۔ میں اسکے سارے جواب آنکھ بند کئے سناتی گئی، تب میری کلاس کے لڑکے میری ذہانت سے مرعوب ہوئے۔ میں نے کسی کو خوش فہمیاں نہ پال لینے، اور ایک خار دار راستے پہ چلنے سے روک دینے کے لئے اگر خود کو تین سال سے بے اولاد کہلوایا، خود کو کرسڈ ظاہر کرنے کی کوشش کی تو کیا غلط کیا۔؟“

”ہاں یہ غلط تھا۔ کوئی تم سے مرعوب ہوتا ہے، تمہاری پرستش کرتا ہے تو کرنے دو، یہ تمہارا حق ہے وصول کرو۔“ اس نے کہتے ہوئے کافی کا ایک لمبا گھونٹ لیا، اتنی پریشان کن صورتحال میں وہ بھول گئی تھی کہ چند لمحہ قبل وہ اس کافی کی شان میں کیا کیا کہہ چکی ہے۔ خیر۔ اب آگے۔

”زینیا حاکم جھوٹی نہیں ہے آنٹی، ہاں زینیا موقع پرست، بازی پلٹ دینے والی ہے۔ ہاں میں نے کہانی گڑھی کیونکہ کہانی نے مجھے بچا لیا۔ میں نے خود کو آفت زدہ کہلوا دیا تاکہ لوگ مجھ سے دور رہیں۔ میں مقابلہ بازی نہیں کرنے آئی۔ میں یہاں لوگوں کی نظروں میں کھٹکنے نہیں آئی۔ میں سیف گیم کھیلنے آئی ہوں۔ کیونکہ اگر میں گری، تو میرے ساتھ گرنے والی کئی لڑکیاں ہوں گی۔ میں واپس گئی تو اگلے کئی سال کوئی ماں باپ اپنی بیٹی کی تعلیم کے حق میں نہیں ہوگا۔ میرے کندھوں پہ ڈھیر سارا بوجھ ہے آنٹی۔ اس بڑے شہر کے monsters کا بھی۔ اور اس چھوٹے شہر کی میری راہ تکتی innocents کا بھی۔“ وہ سانس لینے کو رکی آنٹی قائل ہو گئی تھیں واللہ وہ قائل لگتی تھیں۔

”مجھے واپس بھیج دیں گی۔ میں ڈھیٹ ہوں ضدی ہوں دوبارہ کسی اور ہاسٹل آجاؤں گی۔ لیکن کیا آپ ان نہ آنے والی لڑکیوں کا بیڑا اٹھائیں گی۔ انکا حساب آپ کے گلے ہوگا۔“

”واؤ . . . یہ لائسنز تمہاری اپنی ہیں۔؟ یا کسی ناول کی ہیں اصل میں مجھے ناولز کی لائن یاد نہیں رہتیں
میں“

”شیزل اب اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا تو میں تمہاری کولڈ کافی کا ڈبہ کوڑے میں ڈال دوں
گی۔ and i mean it "زینیا نے پیچھے مڑ کر غراتے ہوئے کہا تو شیزل نے منہ پہ انگلی رکھ لی۔ لیکن
یہاں سے اٹھ کر نہ گئی۔ (مسائل فیس کرنا، حل کرنا اور ان میں پھنسے لوگ دیکھنا اسکا محبوب مشغلہ تھا
(

آئی واپس صوفے پہ ٹک کر بیٹھ گئیں۔ وہ نیم رضا مند لگتی تھیں۔ ”مجھے اب بھی سمجھ نہیں آ رہی کہ تم
نے اپنے شہر کے متعلق جھوٹ کیوں کہا۔، اسکی تو کوئی معقول وجہ بھی نہیں۔“
”جب چار از حد ضروری جھوٹ بولے جائیں، تب ایک غیر ضروری جھوٹ بول دینا چاہیے۔ میری کور
سٹوری کے لئے ضروری تھا کہ میں خود کو ایک نئے ماحول میں ڈھال کر پیش کروں۔ میں نے بس وہی کیا
ہے۔“

”مہدی سب سچ جانتا ہے اور اسکا کزن آدھا سچ، آدھا جھوٹ کیا یہ سب تمہارے لئے مسائل نہیں کھڑے کرے گا۔“

”مسائل سے پہلے میرے پاس حل آتے ہیں۔ میں دیکھ لوں گی۔ آپ اپنی بات کریں آنٹی۔“ اس نے بازو سینے پہ باندھ لئے تھے۔

”یہ آخری چانس ہوگا زینیا حاکم۔“
 ”قبول ہے۔“

”تمہیں سزا کے طور پہ تین دن کچن سنبھالنا ہوگا۔“
 ”قبول ہے۔“

”تم اپنے پکڑے گئے جھوٹ کی سزا بھگتنے میں اکیلی ہوگی۔ میں تمہاری پشت پناہی نہیں کروں گی۔“
 ”قبول ہے۔“

اس نے شان بے نیازی سے کہا۔ شیزل نے اسکو دیکھتے ہوئے بے زاری سے سر گھمایا۔ ”ایڈی تو نیل آرم اسٹرانگ دی اولاد۔“ (اتنی تم نیل آرم اسٹرانگ کی اولاد۔) وہ زور سے بڑبڑائی۔ آنٹی اٹھ کر چلی

گئیں۔ تو زینیا نے صوفے کے ہتھے سے ٹیک لگا لی۔ پھر اپنی ملکہ بد جیسی نظریں شیزل کی جانب موڑیں۔

شیزل کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔

”کافی بہت پسند ہے ناں تمہیں۔“ وہ مسکرا رہی تھی۔

”میری کافی کو گندی نظر سے مت دیکھنا۔“ شیزل نے مگ سینے سے لگا لیا۔

”کافی کے ساتھ ایک بہترین کرائم تھرلر، اور اپنے سامنے ہوتا فیملی ڈرامہ۔ آہ تمہاری ڈریم وشنز۔ ہے

ناں۔؟“ وہ ہنوز مسکرا رہی تھی۔ شیزل نے فوراً سے کتاب ہاتھ سے پیچھے کر لی۔ ”کتاب کا کوئی مذاق نہیں

زینیا۔“ اس نے وارن کیا۔

زینیا اٹھ کھڑی ہوئی۔ چھوٹے چوٹھے قدم لیتی لاؤنج کے دروازے تک گئی، شیزل نے سکھ کا سانس لیا

۔ (گئی ڈائن۔) یکدم وہ مڑی۔ محظوظ نظروں سے اسے دیکھا۔

”اس کتاب کا مرکزی کردار مرا نہیں قتل ہوا ہے۔ وہ بھی اپنی بیوی کے ہاتھوں۔ قاتلہ آخر تک پولیس

کے ہاتھ نہیں آئے گی۔ یہ کتاب، ایک ہیرو کی نہیں ولن کی ہے۔ امید ہے تم ان اسپائلرز کے بعد بھی

اپنی کافی انجوائے کرو گی۔ اور اپنی ریڈنگ سے پر سکون رہو گی۔“

شیزل آنکھیں، منہ، کھولے اسے دیکھتی رہی۔ اسکا ڈیڑھ ہزار ضائع ہو چکا تھا۔ اسکا بس نہیں چلتا تھا اپنے نقصان پہ کفن لپیٹ کر سو جائے۔ شیزل سیمسن کی زندگی برباد ہو چکی تھی۔ اور وہ صدمے سے شل رہ گئی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

رات نے منہ کھول کر شام کی نیلاہٹ کو اپنا شکار بنا لیا۔ اور اسلام آباد پہ یوں تاریکی پھیلا دی گویا یہاں کبھی کسی قسم کی روشنی آئی ہی نہ ہو۔ ایسے میں ہمارا رخ روشنیاں ہوں گی، ایک ہلکا پھلکا ماحول اور ترو تازہ کر دینے والی گفتگو ہوگی۔ اور کہانی کا کونسا کردار، آپ کو ہلکا پھلکا کر سکتا ہے۔؟

براق حنیف کا پینٹ ہاؤس زرد بتیوں میں جگمگا رہا تھا۔ داخلی دروازہ پار کرتے، راہداریوں میں قدم دھرتے، پینٹ ہاؤس کی آرائش پہ اپنا دل لٹاتے پول سائیڈ پہ آؤ تو اس وقت وہاں تین لوگ موجود تھے۔ تینوں نے ایک جیسا لباس سیاہ ٹی شرٹ اور سیاہ ہی ٹراؤزر پہن رکھے تھے۔ جن کے سینے پہ انگریزی

عبارت friends never lie لکھی تھی۔ یہ اس تین لوگی پارٹی کا ڈریس کوڈ تھا۔ پول سائیڈ کے

سامنے گلاس وال تھی جہاں سے سارا شہر نظر آتا تھا۔ امیر ہونے کا ایک فائدہ ہوتا ہے، آپ گھر کو ایک

حسین لک دینے کے لئے کروڑوں خرچ کر سکتے ہیں۔ اب لوگ اسے چونچلہ کہیں، یا شوق انکی مرضی۔
ایک طرف الیکٹرک انگیٹھی کے آگے کھڑا قیس باربی کیو بنا رہا تھا۔ تو دوسری جانب اپنے ایک بازو سے
کام کرتا مہدی کبیر لمبی میز جو کہ عین پول کے سامنے تھی، اسے سجا رہا تھا۔ براق حنیف پیروں کو پول
کے پانی میں ڈبوئے عربی غزل گنگنا رہا تھا۔

”ویسے میری آخری اطلاعات کے مطابق میں تمہارے باپ کا زر خرید غلام نہیں ہوں۔“ قیس سیخ کو
پلٹتے ہوئے مصروف انداز میں بولا تھا۔

”اور میری آخری اطلاعات کے مطابق میں تمہاری ماں کے جہیز میں آئی لونڈی نہیں ہوں۔“ اٹالین ڈنر
سیٹ کو میز پہ سجاتا مہدی بھی اپنا حصہ ڈال گیا۔

”لیکن میری آخری اطلاعات کے مطابق میں ایک حسین، معصوم، جانباز، دگفتار شہزادہ ضرور ہوں۔ جس
کے ہاتھ کام کرنے سے تھک جائیں گے۔“ براق نے اپنی منطق پیش کی۔

”اور یہ اطلاع تم تک پہنچانے والا کون ہے۔؟“ قیس نے پلیٹ باربی کیو سے بھر دی۔

”میری ایک انتہائی حسین گریفینڈ اس نے مجھ سے کہا ہے بابو تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں۔...“

”لڑکیوں کی بات کا متضاد مطلب لیتے ہیں۔ جب وہ کہے تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں تب وہ کہنا چاہتی ہوگی۔ بابو تمہاری چمڑی تو چمڑے سے بھی زیادہ سخت ہے۔“ قیس نے اسکی بات اچک لی۔

براق سوچ میں پڑ گیا۔ ”آج میری نویں نمبر والی گرافریڈ نے کہا کہ اسکے گھر والے مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ پھر اسکا مطلب کیا ہوا۔“

”اسکا مطلب یہ ہوا کہ کہ جان پہلے تو تمہارے کارڈ اور خون صرف میں چوس رہی تھی۔ اب حصے دار آنے والے ہیں تیار ہو جاؤ۔“ فرانسی گلاس لگاتا مہدی کیا تشریح کر رہا تھا۔ براق نے افسردہ ہو کر گردن ڈھلکا دی۔

”یعنی اگر کبھی کسی دور میں مجھ جیسا لا ابالی، شوخ، زمانے کا بھٹکایا ہوا مرد ایک عزت دار زندگی گزارنے کی آرزو کروں گا تو مجھے ایسی ہی ٹاکسک لڑکیاں ملیں گی۔؟ کیا میرے لئے نیکی کا کوئی راستہ نہیں۔“

قیس نے ایک سیخ ہاتھ میں بلند کی۔ اور دوسری کو اب بھی پلٹ رہا تھا۔ ”راستہ ہے، ہر دفع ہوتا ہے لیکن تم اپنے راستے میں کھڑے شیطان خود ہو براق۔ عورت بھی اس مرد کو برا بناتی ہے جس کے اپنے دل میں کھوٹ ہو۔“ بات میں دم تھا، یا پھر براق کی ڈھلکی گردن اب تھک چکی تھی کہ وہ کوئی جواب

نہ دے پایا۔ کچھ دیر بعد وہ تینوں باربی کیو کی پلیٹس ہاتھ میں لئے، جوس کا گلاس ساتھ رکھے، پیر پول کے پانی میں ڈبوئے بیٹھے تھے۔ ساتھ ایک ٹرے رکھی تھی۔ جس میں باقی کے لوازمات تھے۔ پلیٹ میں مختلف سائز بھی تھیں۔ اور ایک طرف رکھے ٹرے میں چاولوں کی پلیٹ تھی۔ اس وقت وہ تینوں جگری یار لگ رہے تھے۔ لیکن سچ تم سے بہتر کون جانتا ہے۔؟

”ویسے ایک بات ہے۔“ براق سوچتے ہوئے کہنے لگا۔ ”ہم تینوں میں سب سے زیادہ خبیث کون ہے۔“ اسکی بات پہ باقی دو بھی سوچ میں پڑے۔ نوالہ چباتا منہ رک گیا۔ ہاتھ میں پکڑے مشروب نے ساکن ہو کر انہیں دیکھا۔ ”ایسا کرتے ہیں موازنہ کر لیتے ہیں۔ ہم تینوں اپنی اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا گناہ بتائیں گے، اور پھر ایک نیکی۔ جسکی نیکی بھاری پڑی وہ سکندر۔ کیا کہتے ہو۔؟“

”مجھے اس قسم کے فضول کھیل میں کوئی دلچسپی نہیں۔“ قیس نے ناگواری سے ٹوکا۔

”امی کہتی ہیں، جو ڈرتا ہے وہ چور ہوتا ہے۔“ براق نے جوس کا گھونٹ بھرتے ہوئے تبصرہ کیا۔ مہدی البتہ پر سوچ لگتا تھا۔ اسکے ایک ہاتھ میں پلیٹ تھی۔ اور دوسرا ہاتھ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ وہ بس پلیٹ

پکڑے بیٹھا تھا، اسے کھلانے والا قیس تھا، جوس کا گلاس اسکے لبوں سے لگانے والا براق حنیف تھا۔ کیا تمہیں اب بھی انکے جگری یار ہونے پہ شک ہے؟

”سب سے پہلے میں سناؤں گا۔“ مہدی نے فیصلہ سنایا۔ ”میرا گناہ یہ ہے کہ کچھ وقت پہلے جب میں وینس گیا تھا، تو وہاں میرے ٹور گائیڈ نے اپنی بیوی کو میرے سامنے تھپڑ مارے، اور اسکا گلا دبایا۔ اسی وقت وہاں پولیس آگئی لڑکی نے مجھے چشم دید گواہ کے طور پہ متعارف کروایا لیکن میں مکر گیا۔ میں نے کہہ دیا میں نے کچھ بھی نہیں دیکھا۔“ وہ ایک پل کو رکا۔ براق نے تاسف سے اسے دیکھا۔ اور جوس کا گلاس اسکے لبوں سے لگایا، زخمی اسپیکر نے دو گھونٹ بھرے، قیس نے کانٹے کی مدد سے اسے باربی کیو کا ایک ٹکڑا کھلایا۔ مہدی نے پوری طرح چبایا، نگلا اور اب وہ بولنے کو تیار تھا۔

”میں اپنی ٹریول لائف پہ تھانہ، چار جز اور ایک بار سوخ خاندان کے آدمی کا انتقام نہیں داغ سکتا تھا۔ یہ تھا میرا گناہ۔“ کچھ پل کے لئے تینوں مرد خاموش ہو گئے۔ یہاں تک کہ کانٹا بھی نہ اٹھایا، جوس کے گلاس کو ہوا میں معلق رہنے دیا۔ یک منٹ کا سوگ بیتا تو مہدی نے ایک بار پھر کہنا شروع کیا۔

”میری نیکی یہ ہے کہ جب میں پچھلے سال کوریا گیا تھا۔ تب ایک نسبتاً کم خوبصورت لڑکی کو چار سے پانچ لڑکیاں بلی کر رہی تھیں۔ یہاں تک کہ انہوں نے منی اسٹریٹرز سے اسکا بازو بھی جلا دیا اور تب میں وہاں ان سب سے لڑنے والا اکیلا آدمی تھا۔ وہاں میں نے مار بھی کھائی، مجھے کافی گہری چوٹ بھی آئی اس بلی لڑکی کے گارڈز مجھ سے زیادہ تنگڑے تھے۔ لیکن میں نے اس لڑکی کو بچا لیا تھا۔“

پلیٹ میں کانٹا بجا بجا کر گویا تالی بجائی گئی۔ اسکے دائیں بائیں بیٹھے مردوں نے اسکی حوصلہ افزائی کی تھی۔

”اب قیس کی باری۔“ براق کی توپوں کا رخ قیس کی جانب ہوا۔ سیاہ آنکھوں والے مرد نے لمبی گہری سانس لی، کانٹے میں باربی کیو کا ذرا اٹکا کر مہدی کے منہ کے قریب لے گیا۔ ساتھ ذرا سے چاول بھی اسے کھلائے۔

”میرا گناہ یہ ہے کہ جب میں دس سال کا تھا تو میرے بابا نے کچھ لوگوں کو ڈیرے پہ باندھ دیا تھا۔ ان کا قصور یہ تھا کہ ابانے ان دو آدمیوں کو منع کیا تھا کہ جب ڈیرے سے گزر رہے ہو تو ریڈیو پہ گانے نہ لگایا کرو۔ لیکن وہ آدمی باز نہ آئے۔ بابا نے ان کو درخت سے باندھ دیا، سخت سردی کا موسم تھا اور بابا نے ان دونوں کو یہ سزا کے طور پہ دو ملازم انکے سر پہ کھڑے کر دیے جو ان دونوں پہ ٹھنڈا برف

پانی ڈالتے تھے، اور چار پنکھے انکے دائیں بائیں چلا دیئے۔ بابا کسی کام سے چلے گئے اور مجھے میرے چھوٹے بھائی کے ساتھ وہیں چھوڑ گئے۔ "وہ بولتے بولتے رکا، دونوں مرد محو سے اسے سن رہے تھے۔ قیس نے پلیٹ میں رکھے کھانے کا ایک اور نوالا مہدی کی جانب بڑھایا۔

”میرا بھائی مستقیم ان دونوں مردوں کو ٹھٹھرتے دیکھ تالیاں بجا رہا تھا، میں اس وقت بھی سمجھتا تھا کہ یہ ظلم ہے۔ لیکن اپنے بھائی کی خوشی کی خاطر ملازمین کو حکم دیا کہ انکے اوپر پانی ڈالتے رہیں۔ یہاں تک کہ وہ دونوں بے“

”راستہ ڈالو . . .“ بولتے ہوئے قیس کی بات مہدی کمبیر نے کاٹی۔ وہ سادے چاولوں کے اوپر راستہ ڈالنے کی فرمائش کر رہا تھا۔ قیس نے رخ بدل کر چھوٹی باؤل سے راستے کے دو چچ چاولوں کے اوپر ڈالے، براق نے مشروب مہدی کے لبوں سے لگایا، گھونٹ بھرنے کے بعد اب وہ چاولوں کے لئے منہ کھولے ہوئے تھا۔ انوکھا لاڈلا۔

”دونوں آدمی اگلے دن تک سردی سے مر گئے تھے۔ اور مجھے آج بھی یہ گناہ اپنی زندگی کا سب سے بڑا گناہ لگتا ہے۔“ اس نے سست روی سے پلیٹ نیچے رکھ دی۔ مہدی اور براق اسے دیکھتے رہے، وہ ہرٹ تھا

- ”خیر میری نیکی یہ ہے کہ میں نے ایک لڑکی کو جیل جانے سے بچایا۔ میں نے اس کا کیریئر بھی بچایا، اسکی عزت بھی بچائی، اور اسکی ذہنی صحت بھی۔ تھانہ صرف عزت نہیں ذہنی صحت بھی برباد کر دیتا ہے۔ میں نے اسے بچایا۔“

”تم نے واقعی ایک عظیم کام کیا ہے۔ لیکن تمہارے نزدیک ایک لڑکی، اور تمہارا اسکی مدد کرنا یہ بات کچھ سمجھ نہیں آئی۔“ براق اپنی زبان کی کھجلی نہ روک سکا۔

”وہ شادی شدہ اور مسائل زدہ ہے۔ بکواس نہ کرو۔“ قیس نے ناگواری سے ٹوکا۔

”ایک تو آج کل شادی شدہ لڑکیوں کا سیزن ہی آگیا ہے۔ خیر میں براق حنیف ہوں تو انوکھا ہی کام کروں گا، تو میں نیکی سے شروع کرتا ہوں۔ میری نیکی یہ ہے کہ میں نے اپنی ایک گرل فرینڈ کے گھر میں چار سال تک راشن ڈالا۔“

اس نے اپنے دائیں بائیں بیٹھے کزنز کو دیکھا۔ کوئی ستائش نہیں۔ ”میں نے اپنی ایک گرل فرینڈ کی بہن کی شادی کا سارا خرچہ اٹھایا، اسکے بھائی کا ایک اچھے کالج میں داخلہ کروایا۔“ گردن موڑی، دائیں بائیں۔

اُونہوں اب بھی کوئی رسپانس نہیں

”میں نے اپنی ایک گریفینڈ جس سے میں قطعی محبت نہیں کرتا تھا، اس سے جھوٹ کہا کہ مجھے کینسر ہے۔ اور میں اس سے شادی نہیں کر سکتا، اور پھر اسکی شادی ایک اچھے خاندان میں کروا دی۔ تاکہ اسے ایک قدر کرنے والا شوہر ملے۔“ بس یہاں براق حنیف کی نیکیوں نے فل اسٹاپ لگایا۔ لیکن اسکے ساتھ بیٹھے ہوئے دونوں دوستوں نے اب بھی کوئی داد تحسین پیش نہ کی۔

”اب اپنا گناہ بتاؤ . . .“ مہدی نے فرمائش کی۔ براق نے گلا تر کیا، چہرے کی رنگت متغیر ہوئی۔ آنکھوں کے آگے وہ گول چشمے والی لڑکی آئی، صرف وہی تھا جو ان آنکھوں میں چشمے کے باوجود خوشی، اور کرب کے رنگ دیکھ سکتا تھا۔ ”میرے ساتھ کالج میں ایک لڑکی پڑھتی تھی۔ ہم دونوں اسکول سے ساتھ تھے۔ ایک دوسرے سے انتہا کی نفرت کرتے تھے یہاں تک کہ وہ کئی بار میرا سر بھی پھاڑ چکی تھی۔“ قیس جانتا تھا یہ کس کی بات ہو رہی ہے۔ اسے وہ لڑکی یاد تھی۔

”اسکے گھر میں کچھ مسائل تھے۔ وہ کور اپ بہت اچھا کرتی تھی۔ لیکن ایک دن ایک کمزور لمحے میں اس نے مجھے سب بتا دیا۔ وہ بہت رو رہی تھی، وہ ہرٹ تھی۔ میں نے اسے دلاسا دیا، اور یہ بات اپنے تک محدود رکھنے کی تسلی کروائی۔ لفظوں سے نہیں آنکھوں اور اعتماد سے۔“ براق کے گلے میں گلی سی ابھر کر معدوم ہوئی۔

”اگلے دن ہمارا ایک اور جھگڑا ہوا اور میں نے اسکے سارے راز فاش کر دیے۔ اس دن اس لڑکی کو مجھ سے نفرت بھی نہیں رہی۔ وہ میرے معاملے میں بے حس ہو گئی۔ میں نے اس لڑکی کا اعتماد مسخ کر دیا۔ میں نے اسکے ساتھ بہت غلط کیا۔ یہ غلطی نہیں گناہ تھا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ اسکے ساتھ بیٹھے مرد بھی خاموش ہو گئے تھے۔ یہ واقعی گناہ تھا۔

”پھر بتاؤ ہم میں سے سب سے زیادہ خبیث کون ہے۔“ اس نے ماحول ہلکا پھلکا کرنا چاہا۔ قیس اور مہدی نے بس ایک خاموش اور ملامتی نظر اس پہ ڈالی تھی۔ اور پھر براق حنیف نے گردن جھکا دی۔

”بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی۔“ وہ ہولے سے بڑبڑایا۔

☆☆☆☆☆☆

تھکی ہاری زینیا حاکم اپنے کمرے میں آئی تو ایک نئی مصیبت منہ کھولے بیٹھی تھی۔ اسکی نئی روم میٹ آج اپنا بوریا بستر لئے کمرے میں آدھمکی تھی۔ اسکا سامان، سامان نہیں تھا مال غنیمت کا ٹوکرا تھا۔ یہاں سے وہاں بیگ بکھرے پڑے تھے، کپڑے جوتے، میک اپ کا سامان، سیلفی اسٹک، کیمرہ اسٹینڈ، کیمرہ لائٹ۔ یہ سب برداشت ہو سکتا تھا لیکن اسکے بیڈ پہ بیٹھی گپے لگاتی چار لڑکیاں نہیں۔ ہاسٹل ایسا ہی ہوتا

ہے ہر کونے کھدے، کمرے، کچن میں تین سے چار لڑکیاں جمع ہوتی ہیں۔ زینیا کی پچھلی روم میٹ اچھی تھی، ہاں وہ ڈرگ ایڈیکٹ، کرمینل اچھی تھی۔ رات کے دس بجے آتی تھی، صبح کے دس بجے سے پہلے غائب ہو جاتی تھی۔ چوکھٹ پہ کھڑی زینیا بے بسی سے اپنے کمرے میں بیٹھی ان لڑکیوں کو دیکھ رہی تھی، جو ہاتھ اٹھا اٹھا کر بول رہی تھیں۔

”ارے . . . زینیا تم آؤ ناں۔“ مناہل نامی اس کی روم میٹ چہک رہی تھی۔ زینیا بدستور دروازے پہ جہی رہی۔ ”تمہیں میں یاد ہوں ناں۔ ارے جس دن تم آئی تھیں ناں ہم میس میں ملے تھے۔ اسکے بعد میرا ایک شوٹ تھا، لاہور میں تو میں بڑی ہو گئی تھی۔ آجاؤ باتیں کرتے ہیں۔“ وہ زیادہ خوش اخلاق تھی یا پھر زینیا بد اخلاق۔؟

”یہ میرے پڑھنے کا وقت ہے کیا تم پلیز باہر جا کر پارٹی کر سکتے ہو۔؟“ لگی لیٹی اس نے پہلے کب رکھی تھی جو اب رکھتی۔ مناہل نے اسے یوں دیکھا جیسے اسکا دماغ چل گیا ہو۔

”میں اس وقت اپنے شوٹ کا قصہ سنا رہی ہوں۔ وہ شوٹ جو ملک کے ایک بے حد مشہور فیشن برانڈ کے ساتھ ہوا تھا۔ کیا تم مجھے جانتی بھی ہو۔“ آخر میں اسے گمان ہوا کہ زینیا شاید اسکی مقبولیت سے واقف نہیں ہے۔

”مناہل شیخ، جسکا تعلق راولپنڈی سے ہے۔ جس کے ٹک ٹاک پہ نو لاکھ فالوورز ہیں، یوٹیوب پہ دو لاکھ اور انسٹاگرام پہ دس لاکھ فالوورز۔“ چوکھٹ پہ زینیا کے پیچھے کھڑی شیزل سیمسن مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ہاتھ میں اسٹرابیری ملک کا کاٹن لئے وہ آگے بڑھ آئی۔ زینیا ٹھہر کر اسے دیکھتی رہی۔ مناہل کے کندھے چوڑے ہو گئے تھے۔

”میں نے تمہارا vlog دیکھا تھا۔ تمہیں جو ٹریٹمنٹ دیا گیا وہ تو کسی ملکہ جیسا تھا۔ تم مجھے شروع سے لے کر آخر تک سب بتاؤ۔ آج رات ہم یہی بات کریں گے۔“ وہ بیڈ پہ آلتی پالتی مارے بیٹھ گئی۔ زینیا نے اسے تادیبی نظروں سے گھورا تھا لیکن آج وہ اپنے ڈیڑھ ہزار کا انتقام لئے بغیر یہاں سے اٹھنے والی نہیں تھی۔ زینیا نے ہاتھ میں پکڑے موبائل پہ تیز تیز کچھ ٹائپ کیا۔ شیزل کے موبائل پہ زینیا کے ٹائپ شدہ الفاظ جگمگائے۔ ”میرے پڑھنے کا وقت ہے یہ تماشا بند کرواؤ۔“

”تم جانتی ہو ناں یہ لڑکی کون ہے، اس سے لڑنا ہے کیا۔؟ میں اس تماشے میں ہی خوش ہوں۔“ اسکی لمبے ناخنوں والی انگلیوں نے فوراً جواب لکھا۔

”یہ لڑکی اگلے تین گھنٹے خاموش نہیں ہو سکتی، تم اسے کیسے برداشت کرو گی۔؟“

”میں ایک extrovert ہوں یہ چاہے اگلی تین صدیاں بولتی رہے مجھے فرق نہیں پڑتا۔“ زینیا نے موبائل سے نظریں اٹھا کر اس ڈھیٹ کو دیکھا، جو مناہل کی باتوں پہ مصنوعی مرعوب نظر آتی تھی۔

”تم کیا چاہتی ہو۔؟“ یک سٹری میج شیزل کے پاس اڑ کر پہنچا۔

”تم نے میری کہانی برباد کر دی میں آج رات تمہاری پڑھائی برباد کرنا چاہتی ہوں۔“

”اگر میں تمہیں اس سے زیادہ اعلیٰ اور سچی کہانی سناؤں تو۔؟“ ان دونوں کی نظریں بیک وقت ایک دوسرے سے ملیں، زینیا مسکرا رہی تھی۔ شیزل اسے دیکھ کر مسکرائی۔

”تم نے مجھ سے پوچھا نہیں کہ میں نے اس ڈرگز کے بیگ کو کیوں ساتھ رکھا۔“ کچھ دیر بعد وہ دونوں لان میں بیٹھی تھیں۔ لڑکیوں کا ایک ٹولہ ان سے ذرا فاصلے پہ تھا۔ کچھ کتابیں لئے بیٹھی تھیں، کچھ کے ہاتھوں میں موبائل فونز تھے۔

”انسان کا حال اسکے ماضی سے جڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک عمل جو ہمیں غیر ضروری، عجیب یا پھر بہت برا لگتا ہے، وہ دراصل انسان اپنے ماضی سے خوفزدہ یا پھر انسپائرڈ ہو کر کرتا ہے۔ ماضی بیت جاتا ہے، لیکن وہ ہمارے اندر ایک ٹرگر بٹن چھوڑ جاتا ہے جب ہم اپنے حال میں اپنے ہی ماضی میں ہوئے کسی واقعے کا عکس دیکھتے ہیں۔ تو ہمارا رد عمل وہ ہوتا ہے جو ہم نے ماضی میں کیا ہو اور اس نے ہمیں بچا لیا ہو، یا پھر وہ جو ہم نے ماضی میں کیا ہو اور آج اسے آزما کر دیکھ لینا چاہتے ہوں۔ میں جانتی ہوں تم نے جو کچھ بھی کیا اسکے پیچھے کوئی بہت بڑی وجہ ہوگی۔” تاریخ دانوں کو بلا کر آج لکھوانا چاہئے تھا کہ شیزل سیمسن نے اتنی لمبی بات کہی تھی۔

زینیا چپ چاپ اسے دیکھ رہی تھی۔ شیزل نے کھنکھار کر اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

”کہانی شروع کریں زینیا حاکم۔“

☆☆☆☆☆☆☆☆

کمبر محل پہ آج تاریکی کا راج تھا۔ مقصود کمبیر کا سیاہ و سفید کمرہ آج اپنے سینے پہ دو نفوس کی موجودگی لئے ہوئے تھا۔ مقصود کمبیر بیڈ سے ٹیک لگائے ہوئے تھے۔ قیس انکے سامنے بیٹھا تھا، ذرا فاصلے پہ، اس

سیاہ ریکلائزر پہ۔ اپنے چچا سے وہ آج اتنے دن بعد مل رہا تھا، انہوں نے قیس کو عبداللہ پکار کر اسکا دل دکھایا تھا۔ لیکن وہ اسکا خاندان تھے۔ قیس ان سے لڑ نہیں سکتا تھا، زیادہ عرصہ ناراض نہیں رہ سکتا تھا۔

”آپ دوائی نہیں لے رہے چچا، جانتے ہیں صحت کے لئے کتنا خطرناک ہے۔؟“

”اس طرح محبت سے بات مت کرو مجھ سے۔ وہی لہجہ، وہی طنز، وہی بدگمانی واپس لاؤ۔ جب اسے دل سے نہیں نکال سکتے، تو دل میں چھپاؤ بھی مت۔“ قیس نے گہری لمبی سانس لی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا اور انکی سائیڈ ٹیبل پہ رکھی دوائیوں کے پتے اٹھائے۔

”مجھے نہیں معلوم تم کیا کر رہے ہو قیس، میں نہیں جانتا تم خود کو کہاں پھنسا رہے ہو، لیکن میں

تمہارے لئے فکر مند ہوں۔“ اس نے چند رنگ برنگی گولیاں نکال کر انکے ہاتھ پہ رکھیں۔

”تم نے ایک لڑکی کو اپنے گھر کے خفیہ راستوں کے راز دیئے ہیں۔ تمہارے گھر میں منشیات کے تھیلے

پڑے ہیں۔ تم نے صرف ایک ہاسٹل کی لڑکی کے مستقبل کے لئے اپنے حال میں مسائل کھڑے کر

دیئے ہیں . . . تم . . .“

”نہ اس لڑکی کا مستقبل نہ میرا حال میں نے جو کچھ بھی کیا اپنے ماضی کے زیر اثر آ کر کیا۔“ اس نے کھوکھلے لہجے میں انکی بات کاٹی۔ ”انسان اور اسکا ماضی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔ کبھی ماضی حاوی ہو جاتا ہے اور کبھی انسان۔ اس روز میرا ماضی مجھ پہ حاوی ہو گیا تھا۔ جن لوگوں نے مسائل دیکھے ہوں وہ اپنے جیسے لوگوں کو بچا لیا کرتے ہیں۔ میں بے وقوف نہیں مسیحا تھا۔“

”اس شہر نے مجھ سے بہت کچھ چھینا ہے۔ میں یہاں آتے وقت معصوم تھا۔ اس شہر نے مجھ سے میری معصومیت چھین لی، میں اسے کسی اور کی معصومیت چھیننے نہیں دے سکتا تھا۔“

(کئی سال قبل کا ذکر ہے۔ ماضی کا قیس سولہ سترہ برس کا تھا۔ اسکے باپ کے قتل، خاندان کی موت کو چند ماہ بیت چکے تھے۔ اسلام آباد آئے ہوئے اسے تین دن سے اوپر ہو چکے تھے۔ اسکے بختیار چچا زندگی اور موت سے لڑ رہے تھے۔ اور دوسرے بر وقت علاج نہ ہونے کی وجہ سے معذور ہو چکے تھے۔ ہسپتال کے بستر پہ پڑے اسکے چچا اسکی مدد کے منتظر تھے۔ وہ شہزادہ تھا۔ ساری زندگی آس پاس ملازم، لوگ، چاکری، روپیہ پیسہ دیکھا تھا۔ آج حالات زندگی اسے عجب ڈگر پہ لے آئے تھے۔ وہ اس وقت اپنے شراکت دار کے گھر میں بیٹھا تھا۔

اسکی حالت خراب تھی۔ کپڑے ملگجے سے، گھنگھریالے بال بکھرے ہوئے، چہرہ ستا ہوا اور کئی دنوں کی تھکن کا مارا۔ اسکی آنکھوں کے نیچے حلقے تھے۔ آنکھیں بار بار گیلی ہو رہی تھیں جنہیں وہ بے دردی سے رگڑ رہا تھا۔ دائیں ٹانگ اضطرابی کیفیت میں جھلاتے ہوئے وہ کسی کا انتظار کر رہا تھا۔ بلاخر اسکا انتظار ختم ہوا تھا۔ اسکے سامنے دو مرد آکر بیٹھے انکی عمریں پینتالیس، چھیالیس کے ہندسے کو چھوتی تھیں۔ چہرے پہ فکر مندی اور ٹھاٹھ شہنشاہوں والے تھے۔ یہ اسکے بابا کے ساتھ کاروبار میں شریک تھے۔ رسمی گفتگو کے بعد قیس مدے پہ آیا تھا۔

”خالق صاحب میں آپ سے اپنے بابا کے حصے سے کچھ رقم لینے آیا ہوں۔“ اس نے صوفے پہ آگے کو ہو کر بات کا آغاز کیا۔ ”دراصل میرے چچا بہت بیمار ہیں اور اس وقت ہم پہ ایک برا وقت آیا ہے۔ نہ چیک بک، نہ بینک۔ بیلنس اس وقت ہمارے پاس کچھ نہیں آپ سمجھ رہے ہیں ناں۔“ اس نے ٹھہر کر تائید چاہی۔ خالق صاحب نے سنجیدگی سے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید بولنے کو کہا اور اسکی حوصلہ افزائی کی۔

”بس ایک ڈیڑھ سال بعد میں اپنا کاروبار خود چلا سکوں گا، لیکن تب تک کے لئے وہ آپ کے پاس ہے۔ مجھے بس کچھ رقم چاہیے۔ کاروبار کے منافع سے ہمارے حصے کی رقم۔“

خالق صاحب مسکرا کر آگے کو ہوئے۔ قیس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا۔ وہ چند ماہ پہلے یتیم ہوا تھا۔ یوں کسی کی محبت ملنا، یوں اعتماد ملنا یہ سب نعمت لگ رہا تھا۔ چند پل بعد اس کے سامنے چائے اور ڈھیر سارے لوازمات رکھے تھے، چند کاغذ کے ٹکڑے بھی جن میں قیس کے باپ اور چچا کے ساتھ ہونے والے معاہدے تھے۔ وہاں ہر ہر صفحے پہ یہی لکھا تھا کہ عبداللہ زمان اپنے والد اور چچا کی غیر موجودگی میں سارے کاروبار کا وارث ہے۔ پھر چاہے اسکی عمر سولہ برس ہو یا پھر ساٹھ۔

ان دو مردوں نے اسکی حوصلہ افزائی کی، اسے اچھا کھانا کھلایا، پیسے دیئے، ساتھ کا یقین دلایا اور قیس ان وقتوں میں معصوم ہوا کرتا تھا۔ وہ ان دو لوگوں پہ بھروسہ کر گیا۔ اس پیدل چل کر آنے والے کو واپسی میں گاڑی میں سوار کر کے بھیجا گیا تھا۔ مارے تشکر کے احساس کے قیس کا دل بھاری ہونے لگا۔ ہاسٹل کے لان میں پلاسٹک کی کرسی پہ بیٹھی زینیا حاکم کی نظریں دور آسمان کو تکتی تھیں۔ سینے میں جلن کا احساس ہوتا تھا۔ وہ بہت بری طرح ہرٹ نظر آتی تھی۔ ”میری ایک دوست تھی۔“ کافی وقت بعد وہ ہلکے لہجے میں بولنا شروع ہوئی۔ ”ہم دونوں کے درمیان کچھ ہوا تھا، جسکی وجہ سے ہم الگ ہو گئے۔ لیکن میں اسکی خبر رکھا کرتی تھی، اسکی سالگرہ پہ ہر دفع ایک غیر شناسا نمبر سے اسے میسج کرتی تھی۔ ہمارے درمیان فاصلے تھے، لیکن ہمارے درمیان نیک نیتی بھی تھی۔ بڑے شہر نے اسکے ساتھ بہت برا کیا تھا۔“

ماضی میں دور کہیں زینیا حاکم کے سنجیدہ چہرے پہ اس وقت جوش سا تھا۔ وہ ٹی وی کے سامنے بیٹھی اپنا پسندیدہ شو دیکھ رہی تھی۔ وقفے کے دوران اس نے چینل بدلنا شروع کیا اور اس لمحے اسکی آنکھوں نے ایک منظر دیکھا۔ پولیس نے لاہور کے ایک نجی ہاسٹل سے بہت بڑی تعداد میں منشیات برآمد کی تھی۔ زینیا کے لئے، یا پھر کسی بھی انسان کے لئے ایسی خبر نئی نہ تھی۔ لیکن جو چہرہ اسکے سامنے تھا، وہ بازو جنہیں لیڈی اہلکار اپنے بازوؤں کے نرغے میں لئے جا رہی تھیں زینیا اس منظر کو ساری زندگی نہیں بھول سکتی تھی۔

وہ روتی نہیں تھی، اسے رونا کمزوری لگا کرتا تھا لیکن اس روز ٹی وی پہ ان مناظر کو دیکھتے ہوئے اسکی آنکھیں کب نم ہوئیں اور کب ان سے آنسو رواں ہوئے، اسے معلوم نہ ہو سکا۔ رپورٹر گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔ لیکن زینیا کے کان سن تھے۔

"دو دن قبل، لاہور کے نجی ہاسٹل میں رہنے والی حمنا طاہر جو کہ بیرسٹر سمیع اللہ طاہر کی بیٹی تھیں، انکے جوس میں کسی نے ڈرگز ملا کر دے دیں، ڈوز انتہائی ہونے کے سبب حمنا طاہر موقع پہ جان بحق ہو گئیں۔ تلاشی لینے اور تفصیلات لینے پہ معلوم ہوا ہے کہ حمنا طاہر کی الماس گوہر سے چپقلش تھی۔ جس کی وجہ سے وہ دونوں کافی بار ایک دوسرے سے نفرت کا اظہار کر چکی تھیں۔ لیکن کسی کی زندگی سے

کھیل جانا، یہ کوئی معمولی جھگڑا نہیں بلکہ جرم ہے۔ بلوچستان کے شہر گوادر سے تعلق رکھنے والی الماس گوہر کے کمرے سے منشیات کی ایک بھاری مقدار برآمد ہوئی ہے۔ جوس کا ادھ کھلا پیکٹ اور ان دونوں چیزوں پہ الماس گوہر کے فنگر پرنٹس بھی مل چکے ہیں، پولیس کا کہنا ہے کہ

”اس واقعے سے چند روز پہلے الماس نے مجھے کال کی تھی۔ اس کی عقل، ذہانت سے کئی سٹوڈنٹس اس کے ساتھ تعصب رکھنے لگے تھے۔ اس نے کہا تھا حل نکالو زینیا۔ کیونکہ تمہارے پاس مسائل سے پہلے حل آتے ہیں۔ میں نے اسے کہا تھا جہنم میں جاؤ الماس۔ میں نے ماضی میں ایک الماس کی زندگی برباد کر دی، اور میں نے مستقبل میں کئی الماس بچالیں۔ لیکن مجھے اسے نہیں کہنا چاہیے تھا۔ جہنم میں جاؤ الماس۔“ اسکی نظریں خلا میں جمی تھیں۔ آنکھیں خالی خالی تھیں۔

ان دنوں بشر لاہور میں ہی پڑھا کرتا تھا۔ وہ ضد کر کے اسکے ساتھ لاہور چلی آئی تھی۔ ابا نے لاکھ برا بھلا کہا، بشر نے لاکھ منع کیا لیکن وہ دل کے گلٹس کے ہاتھوں مجبور تھی۔ جیل جیل ایک جگہ نہیں ہوتی جہنم ہوتا ہے۔ زمینی جہنم۔ یہاں جھلسنا ہوتا ہے۔

جالی دار دیوار کے پار زینیا حاکم اسے دیکھ سکتی تھی، وہ جو اسکی دوست تھی۔ جسے زینیا نے خود چھوڑا تھا۔ اسکی حالت بیان سے باہر تھی۔ ایک ہائی پروفائل کیس میں اسے صرف اس لئے پھنسا دیا گیا تھا کہ، چند بگڑے امیر بچوں کے ہاتھوں بلی ہونے کے بجائے اس نے اپنے لئے آواز اٹھائی تھی۔ حمہ طاہر قتل نہیں ہوئی تھی وہ "ایڈوینچر" نامی بلا کے منہ کا نوالہ بن گئی تھی۔ اسے ڈرگزربردستی نہیں دی گئی تھی، اس نے بہادری ثابت کرنے کو، چند لڑکے لڑکیوں کی شہ پہ خود کو عظیم اور ناقابل تسخیر ثابت کرنے کو یہ سفید ذرات خود اپنے حلق میں انڈیلے تھے۔

”تم یہاں سے نکل آؤ گی الماس۔ تم . . . یہ جگہ تمہارے لئے نہیں ہے میں . . .“ وہ دلاسا دیتے دیے خود ہی خاموش ہو گئی آنکھیں بھر بھر رہی تھیں۔ الماس کے چہرے پہ ڈھیر سارے نیل تھے، آنکھیں خشک تھیں۔ اس نے بے تاثر نگاہوں سے جالی کے پار زینیا کو دیکھا۔ اسکے ہاتھ میں سرخ ٹیلی فون تھا۔ زینیا کو اسکی آنکھیں اپنے اندر گڑتی محسوس ہوئیں۔

”تم زینیا حاکم۔ تم ایک گھٹیا دوست ہو۔“ الفاظ تھے کہ چابک زینیا کی روح پہ زخم پڑے۔ ”تم نے مجھے چھوڑا تھا، کیونکہ تمہیں لگا مجھے تمہارے راز معلوم ہو گئے، اور میں ان رازوں سے پردہ اٹھا دوں گی۔“

لیکن شاید تم نہیں جانتی تھیں کہ تم سے دوستی سے پہلے میں تمہارے راز جانتی تھی۔ "جالی کے پار اسکا چہرہ دھندلا ہونے لگا، زینیا کے آنکھیں بھر رہی تھیں، فون پہ گرفت ڈھیلی پڑی۔ وہ ساکن رہ گئی۔

"میں نے کئی بار تمہیں کالز کیں، میں نے کئی بار تم سے ملنا چاہا، کئی بار اپنی سچائی بتانی چاہی لیکن تم نے نہیں سنی، کیونکہ تم صرف اپنا سوچتی تھیں۔ تم خود غرض ہو زینیا۔ ایسے لوگ دوستی نہیں، ضرورت پوری کرتے ہیں۔" وہ بولتے بولتے ٹھہر گئی۔

"تم نے مجھے پہلے بھی اپنے لیے چھوڑا تھا۔ تم آج یہاں بھی اپنے لئے آئی ہو،" زینیا کی آنکھیں شاکی انداز میں پھیلیں۔ "تم اپنے لئے آئی ہو، ہاں بس اپنے لئے۔ تاکہ تم گلٹ سے نکل سکو۔ تم اتنی خود غرض کیسے ہو سکتی ہو زینیا۔؟ یہ خود غرضی تمہیں لے نہ ڈوبے، یہ تمہیں اکیلا کر دے گی۔" جالی کے پار سرخ فون ہاتھ میں لئے، وہ کہہ رہی تھی لیکن زینیا کی سماعتوں پہ سچ کا تھپڑ اتنی زور سے لگا تھا کہ کئی پل وہ اپنی جگہ جامد رہی۔

سیاہ آنکھوں والا شخص بیڈ کے ایک کونے پہ بیٹھا تھا۔ اسکی آنکھیں کھڑکی پہ جمی تھیں۔ وہ کہیں دور تھا بہت دور۔

”اس شہر نے، اس کے لوگوں نے میرے ساتھ دغا کیا۔ ہم چھوٹے علاقوں سے آئے لوگ یہاں مستقبل بنانے آتے ہیں اور زندگی خراب کروا کر چلے جاتے ہیں۔ جب انسان کے ساتھ دھوکا ہوتا ہے، تب وہ دو طرح کا رد عمل دیتا ہے۔ پہلا، وہ saint بن جاتا ہے۔ ساری عمر لوگوں کو دھوکہ کھانے سے بچاتا ہے۔ اور دوسرا۔ ”وہ ایک پل کو رکا، آنکھیں زخمی ہوئیں۔“ وہ سراپا دھوکہ بن جاتا ہے، بات جھوٹ، وعدہ فریب، عمل دغا بازی، سنگت فریب کاری۔ میں ایسا بن گیا ہوں۔۔۔ مجھ دھوکہ ملا، اور میں دھوکے سے بڑا دھوکہ بن گیا۔ میں اس لڑکی کی sanity بچانا چاہتا تھا۔ جس طرح میری بچائی جانی چاہیے تھی، میرے لیے کوئی saviour نہیں آیا، کچھ لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ انہیں بچا لیا جائے۔“

سولہ سترہ برس کا وہ لڑکا گاڑی کی پچھلی نشست پہ بیٹھا تھا۔ اسے ہسپتال سے کالز پہ کالز آ رہی تھیں۔ اپنے چھوٹے موبائل پہ وہ ہر دو تین منٹ بعد اپنے چچا کا حال احوال پوچھ لیتا تھا۔ دفعتاً گاڑی ایک جھٹکے سے رکی۔ وہ پولیس کا چیک پائٹ تھا۔ ڈرائیور اتر کر نیچے گیا۔ دونوں اطراف اونچے لمبے درخت تھے سڑک کشادہ تھی۔ پولیس کے افراد اب ڈرائیور سے بات کر رہے تھے۔ قیس بے صبری سے باہر دیکھ رہا تھا، اسے اس قصے کے ختم ہونے کا انتظار تھا۔ یکدم جیسے اسے ایک خطرے کی گھنٹی موصول ہوئی۔ پولیس گاڑی کی چیکنگ کرنے آنے لگی تھی۔ اسکی جانب سے دروازہ کھولا گیا، بازو سے پکڑ کر ایک تنو مند سے

پولیس والے نے اسے باہر نکالا۔ دو اہلکار اسے جکڑ چکے تھے۔ گاڑی کی ڈگی سے ایک بیگ نکالا جا چکا تھا۔ 'اسلحہ، غیر قانونی اسلحہ، جرم، سزا، تھانہ، ہتھکڑی،' قیس سب کچھ سن رہا تھا، لیکن وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔ اس کے ساتھ دھوکہ ہوا تھا۔ بیگ میں پیسے نہیں اسلحہ تھا۔ پولیس والے اسے گھسیٹ کر لے جا رہے تھے۔ وہ مسلسل چلا رہا تھا۔ اپنی صفائی دے رہا تھا، لیکن کوئی اسے نہیں سن رہا تھا۔

”سر پلیز سر میری بات سنیں سر، میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب میرا نہیں ہے۔ ان چیزوں سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرے چچا ہسپتال میں ہیں، میرے گھر میں چھوٹے کزن ہیں پلیز مجھے جانے دیں۔“ وہ سلاخوں کے پار سے مسلسل چیخ رہا تھا۔ اسکا گلا دکھ رہا تھا، اسے شدت سے پیاس لگی تھی لیکن اس وقت اسے بس ہسپتال جانا تھا جہاں اس کے چچا تھے۔ ”سر مجھے ٹریپ کیا گیا ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں ہے میری بات سنیں خدا کے لئے۔“

چیخ چلا کر بلاخر وہ ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ تھک رہا تھا۔ اسے رونا آرہا تھا۔ سولہ سترہ سال وہ عمر نہیں ہوتی جس میں تھانے کے چکر کاٹے جائیں، جس میں آدھے خاندان کو بوجھ کی طرح اپنے کندھوں پہ لادا جائے، جہاں اپنی بھوک پیاس بھول کر گھر میں موجود اپنے سے چھوٹے چچا زادوں کی فکر کی جائے۔ تھانے کی کوٹھڑی میں دیوار سے ٹیک لگائے وہ اکڑوں بیٹھا تھا۔ بال ماتھے پہ گرے تھے۔ نو عمر چہرے پہ

پریشانی تھی، تھکن تھی۔ سخت گرمی کے دن تھے، اسکا جسم جھلس رہا تھا۔ کئی پل یوں ہی ہمت ہار کر بیٹھنے کے بعد وہ اٹھا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب اس نے محل کا سب سے مضبوط ستون بننے کی ٹھان لی تھی۔ ”سر پلیز مجھے یہاں سے نکالیں، پلیز سر میں نے کچھ نہیں کیا۔“ وہ بیٹھی ہوئی آواز میں پولیس والوں کو اپنی جانب متوجہ کر رہا تھا۔

اے ایس آئی کسی سے فون پہ بات کر رہا تھا۔ قیس جانتا تھا یہ احکام اسکے لئے لیے جا رہے ہیں۔ چند پل بعد کچھ پولیس والے اسے اپنی طرف آتے دکھائی دیئے، قیس کا دل ایک لمحے کے لئے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ وہ جانتا تھا اب کیا ہونے والا تھا۔ وہ جہاں سے آیا تھا، وہاں اس نے سرداری دیکھی تھی۔ لوگ دیکھے تھے، سزائیں دیکھی تھی۔ لیکن اپنے لئے ہمیشہ تخت دیکھا تھا۔

پولیس والے اسے جانوروں کی طرح مار رہے تھے۔ اسکی چیخیں دلدوز تھیں، کوئی کسی جانور کو بھی اس طرح سے نہیں مارتا ہوگا جس طرح وہ ایک نو عمر لڑکے کو مار رہے تھے۔ وہ مار کھا رہا تھا جانتا تھا قصور نہیں ہے لیکن وہ بس پٹ رہا تھا۔ جانوروں کی طرح مار کھاتے ہوئے، وہ کتنا بڑا جانور بننے والا تھا یہ کسی کو علم نہیں تھا۔ کوئی اسے ٹھڈے مار رہا تھا تو کوئی بھاری ہاتھ کے تھپڑ۔ بس چلتا تھا تو بیلٹ سے مارتے تھے۔ وہ انسان تھا چاہے جتنا مضبوط سہی۔ زخم اسے کراہنے پہ مجبور کرتے تھے۔

اندھا سسٹم، کھوکھلا قانون، لمبے ہاتھ سب چپ چاپ بے بسی سے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اسے مارتے ہوئے اسکی ویڈیو بنائی جا رہی تھی۔ وہ نہیں جانتا تھا اسکا مقصد کیا ہے لیکن اسے درد ہو رہا تھا، الٹا لٹکا کر جب اسکی ٹانگوں پہ ڈنڈے مارے جاتے تھے تو اسکی روح تک تڑپ جاتی تھی۔ کچھ ہی پل میں اسکی پیٹھ پہ کبھی نہ مٹنے والے نشان تھے، صرف بدن پہ نہیں روح پہ بھی۔

رسی کھولی گئی وہ دھڑام سے فرش پہ گرا، اسکے چہرے پہ نیل تھے، پتلا فرش جسم پہ لگے زخم مزید جلا رہا تھا۔ وہ درد سے دوہرا ہو کر منہ سے خون تھوک رہا تھا۔ آنکھیں ادھ کھلی تھیں، لیکن ذہن مکمل بیدار۔ وہ ذہن جس میں آج شیطان بسیرا کر چکا تھا۔

”خدا کی قسم میں وقت کا فرعون بن کر واپس آؤں گا۔، خدا کی قسم میں تم سب کو زندہ جلاؤں گا۔ میرا انتظار کرنا، یعنی اپنے زوال کا انتظار کرنا۔“ دھیمی، ہلکی، مردہ آواز میں وہ بڑبڑا رہا تھا۔ درد شدید تھا۔ اس پہ غشی طاری ہونے لگی۔

باہر سے ایک بار پھر آوازیں آنے لگی تھیں۔ شاید ڈیل ہو گئی شاید نہ ہوئی۔ کچھ وقت بعد اس نے دو پولیس والوں کو واپس اندر آتے دیکھا۔ وہ اسے ٹھڈے مار رہے تھے، پھر انہوں نے قیس کو لکڑی کے

تختے پہ الٹا لٹایا، اس میں مزاحمت کی سکت نہیں تھی۔ لیکن تھوڑے ہی لمحوں میں اسکی برہنہ پیٹھ پہ نمک مرچ سے ملا ہوا پانی ڈال رہے تھے۔ (نفسش کے دوران پولیس کے ایذا دینے کا ایک طریقہ۔) تازہ تازہ زخموں پہ جب نمک اور مرچ کا پانی لگا، قیس اس تختے پہ بے دھم ہو گیا۔ اس کے حلق سے چیخ تک نہ نکل سکی۔ اسے لگا وہ مر گیا ہے۔ وہ کوٹھڑی وہ جلن قیس اگلی سات زندگیوں تک نہیں بھول سکتا تھا۔ وہ اگر کہتا تھا جہنم اسکے لئے نئی نہیں ہے تو سچ کہتا تھا۔ اگلے کئی گھنٹے تک وہ درد سے کراہتا رہا، اسکے زخم جل رہے تھے، اسے پیاس لگ رہی تھی، بھوک اب مٹ چکی تھی۔ دو مزید دن وہ اس جہنم میں رہا تھا۔ اسی طرح کا ٹارچر اور ایذا سہنے کے لئے دو دن بعد وکیل اسکی ضمانت کروا کر لے گیا تھا۔

قیس ان تین دنوں کو تین زندگیوں تک نہیں بھولنے والا تھا۔

آسمان پہ ٹمٹماتے ستارے اب مدھم ہونے لگے تھے۔ چاند کی روشنی زمینیا کے چہرے پہ پڑ رہی تھی۔

”اس روزنیں تارہ نے میرے younger self کو ٹرگر کیا تھا۔ میں ایک بار پھر ماضی میں تھی۔ انسان دو eras میں رہ کر فیصلہ کرتا ہے۔ ایک مستقبل کا خوشنما خیال، دوسرا ماضی کا ٹراما، یا پھر ہیل ہو چکا

زخم۔ انسان کبھی بھی حال میں رہ کر فیصلہ نہیں کرتا۔ حال صرف عمل کرتا ہے، فیصلے کا اختیار اسے کبھی

ملا ہی نہیں۔ مجھے بھی نہیں ملا۔ اس روز تم سب کو میں بے وقوف لگی ہوں گی، لیکن میں نہیں تھی۔"

"میں تمہیں یہاں سے نکال لوں گی، تم تم میرا اعتبار کرو میں پلیز میرا اعتبار کرو۔" مارے

بے بسی کے اس کے الفاظ اس کے حلق میں رہ گئے۔ الماس اسے بے تاثر نظروں سے دیکھتی رہی۔

"مجھے یہاں سے میں خود بھی نہیں نکال سکتی۔ تم تو پھر تم ہو زینیا۔ تم جانتی ہو تم مجھے یہاں سے نہیں

نکال سکتیں، تمہارے پاس مسائل سے پہلے حل آتے ہیں۔ لیکن مسائل کے بعد تمہارے پاس کچھ نہیں

رہتا، تم نے کبھی مسائل کا سد باب نہیں کیا، تم نے ہمیشہ ان کے آنے پہ بند باندھا ہے۔ بند ٹوٹ چکا

ہے۔" اسکا لہجہ روبروٹک تھا۔ آنکھیں جذبات سے خالی۔

"ملاقات ختم ہونے والی ہے زینی جلدی کرو۔" بشر نے اسکی کہنی ہلائی۔ زینیا سن کھڑی تھی۔

"تم نے میرے ساتھ ظلم کیا۔ میں نے خود اپنے ساتھ ظلم کیا۔ ہماری دوستی میں کھیل تم شروع کرتی

تھی، بساط تم بچھاتی تھیں، مہرے تم ترتیب دیتی تھیں۔ میں نے اس روز بھی تم سے کال کر کے کہا تھا

بساط بچھانے کا وقت ہے لیکن تم نے کہا تھا۔" جہنم میں جاؤ الماس، جو انسان اپنے مسائل سے خود نہیں

نکل سکتا، پھر مسائل کا فرض ہے کہ اسے نکل لیں۔ "تم نے سہی کہا تھا۔" فون پکڑے ہوئے زینیا کا ہاتھ شل ہو گیا تھا۔ وہ سانس روکے کھڑی تھی

"میرے مسائل نے مجھے نکل لیا۔ تم نے کہا تھا جہنم میں جاؤ، میں جا چکی۔ بس اب ایک کام کرنا، اگر کوئی اور الماس گوہر تم سے مدد مانگے تو اس سے یہ مت کہنا کہ 'جہنم میں جاؤ الماس'۔"

اس نے فون رکھا، اور بغیر کچھ کہے اسٹول سے اتر گئی۔ زینیا حاکم نے کئی سال اس ملاقات کو ایک ٹریجڈی اور نائٹ میئر کی طرح یاد رکھا تھا۔

"میں نے اس روز اس تھانے سے نکلتے ہوئے ایک عہد کیا تھا۔ کہ میں ایک مانسٹر بنوں گا۔"

اسکی ضمانت ہو گئی تھی۔ اب وہ اپنی چیزیں واپس اٹھا رہا تھا۔ وہی ملگجا لباس، جس پہ اب خون کے دھبوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ آنکھیں خالی، البتہ گردن اب بھی اٹھی ہوئی۔ ایس ایچ او کی میز پہ رکھے اسکے سامان میں ایک چیز غائب تھی۔ اسکے باپ کی دی ہوئی گھڑی، قیس نے سپاٹ نظریں اٹھا کر سامنے بیٹھے حیدر نامی ایس ایچ او کو دیکھا، پھر اسکی کلائی میں بندھی گھڑی کو دیکھا۔ چند پل وہ اسے دیکھتا رہا۔ زخم اب بھی جل رہے تھے۔

”میں اپنی معصومیت آج، اس تھانے میں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ آنے والے وقتوں میں تم ایک مانسٹر سے ملو گے۔ میں وقت کا فرعون بن کر پلٹوں گا۔ مجھے یاد رکھنا۔“

”ہر چور، ڈاکو، قاتل، اشتہاری یہاں سے جاتے وقت یہی کہتا ہے۔ ہر ایک کی بات پہ کان دھرنے لگوں تو کل وردی اتار کر سڑک پہ بیٹھوں گا۔“ قیس نے دونوں ہاتھ میز پہ رکھے، اور اسکی جانب ہلکا سا جھکا۔

”بات یہی ہے کہ وہ تھے ہی چور، قاتل، اشتہاری، مجرم۔ میں معصوم تھا۔ میں عام تھا۔ مجھے یاد رکھنا۔ یہ گھڑی رکھو تم وقت گزرنے کا احساس ہوتا رہے گا۔“

اس نے دہرایا۔ پھر اپنا سامان اٹھایا، اور پلٹ گیا۔ افسر محفوظ سا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ یہاں سے قیس کسیر کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا تھا۔

”اس روز میں نے خود سے وعدہ کیا تھا کہ میں آگے جا کر کسی الماس گوہر کو نہیں بچاؤں گی۔“ شیرزل نے ایک جھٹکے سے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”ہاں میں کسی الماس گوہر کو نہیں بچاؤں گی، کیونکہ اگر آپ مسائل سے نکل نہیں سکتے تو مسائل کا حق ہے کہ وہ آپ کو نگل لیں۔“ وہ پر یقین انداز میں بولی۔

وہ نین تارہ سے مار کھا رہی تھی، پھر وہ گھر سے بھاگ رہی تھی۔ اسکے چہرے پہ زخم تھے۔ وہ انجان شہر کی گلیوں میں اندھا دھند بھاگ رہی تھی۔ پولیس اسکا تعاقب کر رہی تھی لیکن وہ مر کر بھی اس بیگ کو کسی کے حوالے نہیں کر سکتی تھی۔ ہاں وہ الماس گوہر کو نہیں بچائے گی کیونکہ وہ ان مسائل سے نکلنے کے لئے کسی اور کو ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ اس الماس کو بچائے گی، جو آنے والے طوفان سے بے خبر ہوگی۔ وہ زینیا حاکم تھی۔ اس روز تھانے سے نکل کر وہ معصوم نہ رہی تو مانسٹر بھی نہیں بنی تھی۔

”میں اس لڑکی کو ہر بار بچاؤں گا، میں اسے اپنے گھر کے خفیہ راستوں سے لے کر، راز بھی دوں گا۔ میں اس کے سامنے ڈھال بھی بنوں گا، اسکے لئے معصوم بھی اور مانسٹر بھی۔ کیونکہ وہ میرا lesser version ہے۔ میں برا نہیں تھا مجھے برا بنایا گیا۔ لیکن قیس وہ آخری برا ہو گا بس اب اور نہیں۔“ وہ کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھا تھا۔ مقصود اسے خاموشی سے دیکھتے رہے، وہ جانتے تھے اب اگر قیس اسکا saviour ہے تو دنیا کی کوئی طاقت اس لڑکی کو گرنے نہیں دے گی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حاکم نواب کے گھر میں رات کا کھانا کھایا جا رہا تھا۔ لمبے دسترخوان پہ آج عروج کی اماں بھی آئی بیٹھی تھیں۔ حاکم نواب سربراہی نشست پہ بیٹھے تھے۔ انکی دائیں جانب کونج حاکم تھی، اور بائیں جانب ضیغم۔ یہاں منگیتر کے سامنے یوں بیٹھنے کو برا سمجھا جاتا تھا، لیکن سلام ہو ابا کی عظمت کو جنہیں اپنی چھوٹی بیٹی کی محبت سب بھلائے ہوئے تھی۔ انہیں آج بھی کونج کوئی دس بارہ سال کی بچی لگا کرتی تھی۔ بشر کو سرے سے ان چیزوں سے فرق ہی نہیں پڑتا تھا، منگیتر ہے تو خیر ہے۔ کوئی اور ہوتا، پھر کبھی منگیتر بننے لائق بھی نہ رہتا۔

”اماں میری پلیٹ میں بوٹیاں کم ہیں، بشر کی پلیٹ دیکھیں۔“ کونج نے ہلکی آواز میں اپنے ساتھ بیٹھی اپنی ماں کو مخاطب کیا۔

”نندی بھائی سے حساب کرتی ہے۔؟ بھائی کے کھانے کو نظر لگائے گی کیا۔ وہ مرد ہے، اسے زیادہ کھانا ملنا چاہیے۔“ اماں نے بھی ہلکی آواز میں ڈپٹ دیا۔

”مرد ہے تو کیا اسکے اندر دوسری زبان، دوسرا معدہ لگا ہے۔؟ اماں آپ کا دو قومی نظریہ ختم نہیں ہوگا۔ آپ بشر کو جناح اور مجھے گاندھی ہی سمجھتی رہیں گی۔“ اسی لمحے بشر جو اسے ہی دیکھ رہا تھا، اپنے سامنے

سے سالن کا ڈونگہ اٹھا کر، تھوڑا سا گوشت نکال کر اسکی پلیٹ میں ڈالا۔ کونج تو کھل اٹھی، باقی سب نے اسے بھائی کا پیار سمجھا۔ البتہ ضیغم بس اپنی مسکراہٹ چھپا رہا تھا۔ عروج اسی طرف دیکھ رہی تھی، جب اماں نے اسے پکارا۔

”عروج بچے آج سالن میں نمک بہت کم ہے۔ تھوڑا احتیاط کیا کرو، اور ہاں یہ دیکھو بچے گھی بھی بہت زیادہ ہے۔ تم بہت اسراف کرتی ہو۔“ انکا لہجہ ماؤں جیسا تھا۔ جیسے ہماری مائیں بھری محفل میں ٹوک کر سوچتی ہیں بیٹی کی اصلاح ہو رہی ہے۔ مائیں اچھی یا بری نہیں ہوتیں مائیں بس معصوم ہوتی ہیں۔

”آپ کو میرے بنائے کھانے میں بہت کیرے نظر آتے ہیں ناں، ظاہر ہے اب میں زینیا جیسی تو نہیں بن سکتی۔ اور ویسے بھی، میں ایسا ہی کھانا بنانا جانتی ہوں، آپ ایسا کریں کل سے خود بنا لیں۔“

”ہاں امینہ اب تم میری بیٹی کے ساتھ یہ معاملے کرنے لگی ہو۔ اپنا پھوہڑ پن بھول گئی ہو۔؟“

امینہ بیگم تو حق دق سی اسے دیکھے گئیں۔ حاکم نواب اب بھی نوالے توڑ رہے تھے۔ اس عورت کی عزت سارا خاندان نہیں کرتا، جسکی عزت اسکا اپنا شوہر نہ کرتا ہو۔

ضیغم چپ چاپ گردن جھکائے کھانا کھا رہا تھا۔ لیکن بشر خاموش نہ رہ سکا۔ ”اماں آئندہ ایسا نہیں ہوگا، اور پھوپھی آپ ہمارے گھر کے معاملات میں دخل نہ دیں۔“ وہ سنجیدگی سے ٹوک گیا۔

”میں تو بس یہ کہہ رہی تھی کہ نمک تھوڑا زیادہ ہے۔ اپنی بچی سمجھ کر ہی کہتی ہوں، ورنہ میری بلا سے بناتی رہے برا کھانا۔ شوہر جانے بیوی جانے۔“

ساتھ بیٹھے بشر نے انکا ہاتھ دبایا۔ ”اماں آج میں نے اس کو کہا تھا کہ گھی زیادہ ڈالے، ورنہ مجھے سالن اچھا ہی نہیں لگتا۔ اسکی غلطی نہیں ہے۔“ اس نے رسان سے سمجھانا چاہا، عروج اسے دیکھ کر رہ گئی۔ وہ کس طرح بھری محفل میں اسے ڈیفینڈ کر رہا تھا۔ کس طرح اسکی غلطی اپنے سر لے رہا تھا۔ اور اگر دین نے مرد کو افضل کہا ہے تو اسی لئے کہا ہے کہ وہ جذبات کے وقت خود پہ کنٹرول رکھے، باتیں درگزر کرے۔ اس لئے نہیں کہ وہ افضل مخلوق اپنے پیر دبوائے، ہاتھ اٹھائے، خود کو عقل کل سمجھے۔

”تم کس خوشی میں زیادہ گھی کھانے لگے ہو۔؟ دو جوتے ماروں گی اور سارا شوق نکل جائے گا۔ لاڈ صاحب کا معدہ تو چڑیا جیسا ہے شوق بازوں والے۔“ اماں کے اندر کی ماں جاگ گئی تھی۔

”باز نہیں اماں جنگلی گدھ والے۔“ کونج کی سرگوشی اتنی اونچی تھی کہ بشر سن سکتا۔

”میں جنگلی گدھ ہی سہی کم از کم مجھے گوشت تو پورا ملتا ہے۔“ حاضر دماغی میں اسکا کوئی ثانی کہاں تھا۔

”بڑے بھائی سے بات کر رہی ہو کونج ذرا سی تمیز رکھو۔“ عروج برداشت نہیں کر پائی۔ کونج نے ہونقوں کی طرح سر اٹھا کر اسے دیکھا، پھر بشر کو وہ اسے نہ بولنے کی تنبیہ کر رہا تھا۔ آج اس دسترخوان پہ ایک نہ ایک زبردست جھگڑا تو ہونا ہی تھا۔ بشر شادی کر کے پچھتایا۔

”آپا اگر وہ مذاق کر رہی ہے، تو اسے اجازت ہوگی ناں۔ آپ بہن بھائی کے معاملے میں نہ آئیں۔“ اگلا جھٹکا کونج کو ضیغم کی بات پہ لگا تھا، اس نے آج تک دیکھا تھا کہ اسکا باپ اسکی ماں کی ہر بات کو غلط کہنے کا عادی ہے، اگر کسی دن صحیح بھی ہوتی تو ماننے سے انکاری، وہ غلط فہمی کے دور کرنے کو بحث سمجھتا تھا۔ کھانا ایک آکورد سے ماحول میں کھایا گیا محفل برخاست ہوئی تو بشر اپنے کمرے میں آیا، جہاں اسکی بیوی آئینے کے سامنے بیٹھی جارحانہ انداز میں چوڑیاں اتار رہی تھی۔ بشر نے ایک نظر اسے دیکھا، پھر اپنا لیپ ٹاپ لے کر وہ بیڈ پہ آ بیٹھا۔ عروج کے تن بدن میں شرارے دوڑ گئے۔

”مجھے یہاں نوکرانی بنانے کے لئے لائے ہو کیا۔؟ پہلے تمہاری ماں مجھے طعنے دے رہی تھی، پھر تمہاری بہن میری برائی کر رہی تھی، اسکے بعد وہ میرے شوہر سے فری ہو کر مجھے منظر سے ہٹانا چاہ رہی تھی

- "وہ تن فن کرتے ہوئے اٹھی اور بشر کے قریب بیڈ کی طرف آئی۔" اور میرا شوہر صاحب ابھی آیا کمرے میں پھر لیپ ٹاپ لے کر بیٹھ گیا۔ مجھے بتاؤ میں کروں تو کیا کروں۔؟"

بشر نے اسے پر سکون نظروں سے دیکھا۔ "یہ سارے کا سارا تمہارے دماغ کا خناس ہے۔ سب سے پہلے آئندہ اپنی ماں کی باتوں میں آئیں تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ وہ جو تمہیں سکھا رہی ہیں ناں کہ کھانے میں نمک کم ڈالو، کپڑے کم صاف کرو تو گھر کے کاموں سے تمہاری جان چھوٹ جائے گی، تو میری بات کان کھول کر سن لو ایسا کچھ نہیں ہونے والا۔ میکے بات سسرال، اور سسرال کی بات میکے اڑانے والی لڑکیوں کی کوئی عزت نہیں کرتا۔" عروج تو شل ہی رہ گئی۔ بشر کو پتہ کیسے چلا۔؟

"دوسری بات کوئج میری بیٹیوں جیسی ہے۔ اسکے سامنے میں نے تمہارا بھرم رکھا اسکا مطلب یہ نہیں کہ میں تمہیں صحیح سمجھتا ہوں۔ اپنا رویہ درست کرلو۔ وہ اماں سے تمہاری برائی نہیں، میرے زیادہ کھانے کی شکایات کر رہی تھی۔"

"تم ایسا کیسے کہہ سکتے ہو تم نے تو اسے سنا بھی نہیں۔" وہ خفا ہوئی۔ بشر سیدھا ہو بیٹھا۔

”اس لئے کیونکہ وہ میری بہن ہے۔ میں اس کو جانتا ہوں۔ وہ تمہاری برائی نہیں کرے گی۔ اور میری اماں تمہیں طعنہ نہیں دے رہی تھیں، انکا طریقہ غلط تھا لیکن بات نہیں۔ کھانے میں واقعی مسئلہ تھا۔ وہی مسئلہ جو تم نے اپنی ماں کے کہنے پہ کیا۔“ عروج کی گردن شرمندگی سے جھکنے لگی۔ ”دیکھو عروج، یہاں تعلق نیا ہے، لوگ نئے ہیں اندازے لگا کر دل میں بغض پال لو گی، یا پھر اپنی ماں کے گھر سے کلاسز لے کر اپنے گھر میں عمل کرو گی تو یاد رکھنا پاس نہیں ہو سکو گی۔“ وہ نرمی سے سمجھا رہا تھا۔

”میری ماں کی عزت کرو، اور اپنی ماں کو اپنے گھریلو معاملات سے دور رکھو یہ دونوں چیزیں تمہیں میرے نزدیک معتبر بنا دیں گی۔ جب دنیا تم پہ بولے گی، تمہارے لئے میں بولوں گا۔ لیکن میں تمہاری تصحیح بھی کروں گا اور مجھے یقین ہے، تم میری بات سمجھ لو گی۔ ہے ناں۔؟“

”بشر تم میری بات سمجھ نہیں رہے۔ کونج میری جگہ آنا چاہتی ہے۔ اسے تمہاری توجہ مجھ سے زیادہ چاہیے۔ میں حصے داری برداشت نہیں کروں گی۔“ بشر کا دل چاہا تھا اپنا سر پیٹ لے۔

”کونج میری بہن ہے اور تم میری بیوی۔ یہ دونوں ایک انتہائی الگ الگ رشتے ہیں۔ میں نے اسے اپنے ہاتھوں میں پالا ہے۔ وہ ایسی نہیں ہے۔ اور اگر کبھی تمہیں لگے بھی کہ وہ ایسی ہے، تو یاد رکھنا بشر حاکم

انصاف کرنا جانتا ہے۔ میں نے اگر آج اماں اور تمہارے معاملے میں انصاف کیا ہے تو آگے بھی کروں گا

۔ بس تم اب ذمہ داری سنبھالو اور دوسروں کی باتیں سننا چھوڑ کر گھر میں اپنا تعلق بناؤ۔ اب میرا دماغ

مت چاٹو۔ "اس نے لیپ ٹاپ ایک بار پھر اٹھا لیا۔ عروج مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہی تھی۔

”سنو ناں . . . بشر سنو . . . بات تو سن لو۔“ وہ اسکے پیر پہ انگلی مار کر اپنی جانب متوجہ کر رہی تھی۔

”عروج تنگ مت کرو فلم دیکھنے دو۔“ وہ بے زار ہوا۔

”مجھ سے بڑی فلم کوئی اور ہو سکتی ہے۔“ وہ کیسے یقین سے کہہ رہی تھی۔ بشر چند لمحہ اسے دیکھا رہا، پھر

گردن جھکا کر ہنس پڑا۔ عروج اسکے ساتھ مسکرائی تھی۔ لیپ ٹاپ گود سے نکال کر ایک طرف رکھتے

ہوئے اب وہ پوری طرح اسکی جانب متوجہ تھا۔ کچھ دیر بعد وہ دونوں مدھم آواز میں خاندان کے کسی

معاملے کو ڈسکس کر رہے تھے۔ بشر کی آنکھیں نیند سے بھر رہی تھی، لیکن وہ سن رہا تھا۔ اسے سننا اچھا لگ

رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔

☆☆☆☆☆☆

ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی زینیا اپنے بالوں میں جلدی جلدی برش کر رہی تھی۔ سرمئی رنگ کی لمبی قمیض کے ساتھ بڑے بڑے پانچوں والا سرمئی ٹراؤزر، اور ہم رنگ دوپٹہ میز پہ دھرا تھا۔ شہد رنگ بالوں کی اب وہ چٹیا گوندھ رہی تھی۔ انہیں کھولنا، اسے بے زاری دیتا تھا۔ شفاف چہرے پہ ایک نظر ڈالتے ہوئے وہ مسکرائی، پھر لپ گلوڑاٹھا کر ہونٹوں پہ ملا۔ بین کالر والے گلے کے آخری بٹن کو بند کرتے ہوئے وہ نیچے جھکی، پیروں میں کولا پوری چپل ڈالے، اسی لمحے اسے اپنا ہاتھ جلتا ہوا سا محسوس ہوا۔ ہلکی سی کراہ کے ساتھ اس نے اپنی انگلی دیکھی، اسکی شادی کی انگوٹھی نے اس کی انگلی زخمی کر دی تھی۔ اس نے انگوٹھی انگلی میں ذرا آگے کھسکائی۔

پھر اپنے بیڈ پہ بیٹھ گئی، انگوٹھی اتار کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز میں رکھی۔ اب کے اس نے اپنی انگلی دیکھی تو دل دھک سے رہ گیا۔ اس کی انگلی پہ زخم کا نشان تھا۔ گول دائرے میں بنا زخم۔ وہ چند پل اپنی زخمی انگوٹھی کو دیکھتی رہی پھر یونیورسٹی جانے کو اٹھی۔ اسی پل باتھروم کے دروازے سے مناہل باہر آتی دکھائی دی۔ اسکے بالوں میں زینیا کا تولیہ تھا۔ اوسی ڈی کی مریضہ کے تن بدن میں آگ لگ چکی تھی۔ ”میری چیزیں اٹھانے کی اجازت تمہیں کس نے دی ہے مناہل۔؟“ وہ تندہی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مناہل نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔

”ہم دونوں روم میٹ ہیں، ایک دوسرے کی چیزیں استعمال کر لیں گے، تو کیا ہوگا۔

take a chill pill"

زینیا کا جی چاہا تھا کہ اسے زمین میں گاڑ دے، مگر وہ آئے دن ہاسٹل میں نئے نئے مسائل افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ سو خاموشی سے زہر کے گھونٹ پیتے باہر چلی گئی۔

یونیورسٹی میں آج اسکی لگاتار کلاسز تھیں۔ اس وقت وہ اپنی آخری اور سب سے اہم کلاس میں بیٹھی تھی جب مہدی اسکے پیچھے والی نشست پہ آکر بیٹھا۔ زینیا اسے بیٹھتے ہوئے دیکھ چکی تھی۔ ہاں البتہ ظاہر نہیں کیا۔ سامنے کھڑے پروفیسر کچھ کہہ رہے تھے۔ جب زینیا کی انگلیاں حرکت میں آئیں، اس نے ایک پیغام لکھا اور weirdo نامی نمبر پہ بھیجا۔

مہدی کے موبائل کی مخصوص ٹیون بجی تو اس نے ایک معذرت خواہ نظر اطراف میں ڈالی۔ اور پیغام پڑھنے لگا۔ ”اس رات شاید آپ نے اپنا ذہنی توازن کھو کر مجھے ایک میسج کیا تھا۔ کیا آپ اب بھی اس

بات پہ قائم ہیں۔“

مہدی کے ذہن میں جھماکا سا ہوا، قسیم کی راہداریوں میں چلتے ہوئے جو میسج اس نے بھیجا تھا اسے فوراً یاد آیا۔ ”میں اس کھیل کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔“ حال میں مہدی کسیر شاید اس میسج کے بھیجنے پہ پچھتا رہا تھا۔ اس نے واپس کوئی پیغام نہیں بھیجا۔ کلاس ختم ہونے کی بیل بجی، یکے بعد دیگرے تمام طلباء کلاس سے باہر نکل گئے، اب وہاں کوئی تھا تو مہدی اور اپنی چیزیں سمیٹتی زینیا حاکم۔

مہدی اپنی جگہ سے اٹھ کر آیا، اور اس کے سامنے والی سطر میں آ کر بیٹھا۔ وہ تھکا ہوا لگتا تھا۔ زینیا کے چہرے کے زخم کو دیکھ اسے بے طرح تاسف ہوا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں تمہارے چہرے پہ یہ زخم کیسے لگے۔“

”جس طرح آپ نے نہیں بتایا کہ آپ کے بازو میں تین گولیاں کیسے لگیں۔“

”کیا تم میری مدد کر سکتی ہو۔؟“

”مجھے واقعے کی نوعیت پتہ ہونی چاہیے، تاکہ میں فیصلہ کر سکوں۔“ زینیا بیٹھ گئی۔ مہدی چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔ کیا وہ اس لڑکی پہ اعتبار کر سکتا تھا۔ کیا یہ اس قابل تھی کہ اس کو راز دیئے جائیں وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا۔

”کوئی میرا تعاقب کرتا ہے۔“ تمام فیصلے ہو گئے تھے۔ ”یونان کی سفید گلیوں سے لے کر، بلوچستان کے پہاڑوں تک، اور پہاڑوں سے میرے کمرے تک۔ اسے ہر جگہ access ہے۔ مجھے لگتا تھا میں پاگل ہو رہا ہوں، لیکن اس روز سمندر پہ جب تم نے بالکل میری طرح کچھ محسوس کیا۔ تب میں جان گیا تھا کہ صرف تم ہو جو میری مدد کر سکتی ہے۔ وہ مجھے ذہنی مریض بنا رہا ہے۔ وہ مجھے خوف زدہ کرتا ہے، نہ مار رہا ہے، نہ مر رہا ہے۔“ وہ جھکے ہوئے سر کے ساتھ شکستگی سے کہہ رہا تھا۔ ”میں آزادی چاہتا ہوں۔ اس ذہنی مرض سے، اس تعاقب کار سے، اور اسکے دیئے زخموں سے۔ کیا تم مجھے بچا سکتی ہو۔؟“

”آپ کو صرف اور صرف آپ کا سچ بچا سکتا ہے۔ یا پھر آپ کا گو اپ۔ دونوں میں سے کسے چنیں گے۔؟ کیا آپ نے اپنی زندگی میں کسی انسان کو مارا ہے۔؟ تکلیف دی ہے۔ جانے یا انجانے میں۔“

”میں نے آج تک کبھی کسی انسان کو جان کر تکلیف نہیں دی۔ میں نے کسی کو اگر انجانے میں بھی تکلیف دی ہے، تو اتنی بڑی نہیں ہو سکتی کہ کوئی مجھے جان سے مرنا چاہے۔“

”آپ کو کیوں لگتا ہے وہ آپ کو مرنا چاہتا ہے۔؟ کیا معلوم وہ آپ سے کوئی راز لینے آیا ہو یا پھر خوف زدہ کرنے۔“ زینیا نے قیاس لگایا۔

”تمہیں اتنا یقین کیوں ہے کہ وہ مجھے مارے گا نہیں۔“

”وہ آپ کو مار سکتا ہے، لیکن ایک وقت لگے گا۔ جب اس قلعے میں وہ آپ کے اوپر گن تان کر کھڑا تھا، تب کسی قسم کی ایکشن فلم نہیں چل رہی تھی۔ وہ آپ کو دو گولیاں مارتا اور چلا جاتا۔ وہ بار بار آتا ہے تاکہ آپ کو بتا سکے کہ اسے آپ سے کچھ چاہیے۔ اس روز اگر وہ تین گولیاں، بازو پہ مار سکتا تھا، تو دو دل پہ بھی مار دیتا۔ اسے کوئی فرق نہ پڑتا۔“ زینیا سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

”اس نے گولی یونہی نہیں ماری، شاید وہ کسی بات سے ٹرگر ہوا تھا۔ آپ اس وقت کیا کر رہے تھے۔“ مہدی نے زہن پہ زور دیا۔

”میں بس اپنے کمرے میں تھا، اور تم سے بات کر رہا تھا۔ میں نے تمہاری شادی کی بات کی“

”آپ نے یو ایس بی کی بات کی تھی۔“ زینیا جیسے ایک خواب سے جاگی۔ مہدی کی رنگت فق ہوئی۔

”اس یو ایس بی کا یہاں کیا قصہ . . . وہ کچھ اور معاملہ ہے، تم اس طرف مت جاؤ۔“

"میں اس طرف نہ جاؤں کیونکہ اس طرف سچائی ہے، ہے ناں۔؟ سوری بٹ نو سوری۔ میں آپ کی مدد تب کر سکتی ہوں جب آپ اپنا پورا سچ لے کر میرے پاس آئیں گے۔" اس نے بیگ کندھے پہ درست کیا۔ اور گول دائرے میں لگی نشستوں سے آگے نکل آئی۔ مہدی یونہی تھکا تھکا سا وہیں بیٹھا رہا۔

"کل جو آدمی آیا تھا، وہ تمہارا شوہر تھا ناں۔" زینیا جاتے جاتے رک گئی۔ "تم نے کہا تھا وہ اچھا یا برا نہیں ہے۔ وہ بس، "جلدی" تھا۔ اتنا جلدی کہ تمہیں اس سے کوئی امید رکھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ میں سپیکر ہوں، لوگوں کے چہرے پڑھ لیتا ہوں۔ اسکی تکلیف تمہیں بری لگ رہی تھی، اس نے شاید تم سے کوئی جھوٹ بولا تھا، یا شاید تمہارا دل توڑا تھا۔"

"اس نے مجھ پہ شک کیا تھا۔" زینیا نے اسکی بات کو روانی دی۔

"تم نے اسے پھر بھی معاف کر دیا۔؟ حالانکہ تم اس سے محبت بھی نہیں کرتیں۔ ایک لڑکی جو اپنے شوہر سے محبت بھی نہیں کرتی، لیکن وہ اسے شکستہ نہیں دیکھ سکتی، ایسا کیوں۔؟ کیا ساری شادیاں اتنی ہی دوغلی ہوتی ہیں۔؟"

”جسے لگتا ہے شادیاں محبت کی وجہ سے چلتی ہیں، وہ دنیا کا سب سے بے وقوف انسان ہے۔“ خالی کلاس روم میں اسکی آواز گونج رہی تھی۔

”شادیاں احساس سے چلتی ہیں۔ شفقت، نرمی، انسانیت کا احساس۔ کئی بار محبت تو شادی کے پہلے مہینے میں ختم ہو جاتی ہے، لیکن وہ شادی سانس لیتی رہتی ہے کیونکہ اس میں احساس ہوتا ہے۔ ایک دوسرے کی فکر ہوتی ہے۔ محبت ایک وقت بعد شفقت میں ڈھل جاتی ہے۔ آپ اپنے پارٹنر کے عادی ہو جاتے ہیں، اسے کمفرٹ دیتے ہیں۔ اور خود بھی اسی کمفرٹ کے سہارے بیس، پچیس سال گزار دیتے ہیں۔ محبت شادی کی بنیاد نہیں ہے۔ بس ایک حصہ ہے۔ شادی کی بنیاد احساس ہے۔“ وہ بولتے ہوئے رکی مہدی کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ ”جانتے ہیں محبت کی اصل جگہ دل ہے۔ لیکن ہم نے اسے سر چڑھا لیا ہے۔ اب اگر اپنی جگہ سے بے وجہ بلا محنت ترقی ملنے لگے گی، پھر کام تو خراب ہوں گے ہی۔“

”ہم نے محبت کو سر چڑھا لیا ہے۔ تم کہنا کیا چاہتی ہو۔؟“ اسے الجھن ہوئی۔

”ہر دوسرا ڈرامہ، فلم، شو، انسان محبت کے بارے میں بات کرتا نظر آئے گا۔ ہم نے محبت کو

overrated کر دیا ہے۔ ہاں ٹھیک ہے دنیا کی بنیاد محبت ہے۔ لیکن دنیا کی بقا اور ترقی کی بنیاد اعتدال

ہے۔ جب چیزوں میں، جذبوں میں اعتدال نہیں رہے گا پھر مسائل پیدا ہوں گے۔ آج کل ہر لڑکی، لڑکے کا مقصد کیا ہے۔؟ ایک محبت کرنے، سرپرست دینے، اور دنیا لٹا دینے والا پارٹنر۔ شادیوں کی ابتدا میں بتایا جاتا ہے کہ ”وہ تم سے محبت کرے گا، وہ اپنی محبت سے تمہیں بدل لے گی۔“ کیا اسکے علاوہ شادی میں کچھ نہیں ہے۔ موجودہ دور میں اگر شادی میں understanding ہے تو محبت ایک ثانوی چیز بن جاتی ہے۔“

”شادیاں کیوں ٹوٹتی ہیں۔؟“ ایک اور سوال۔

”آپ ایک انٹرنیشنل اسپیکر ہیں، مجھ سے جواب کیوں چاہیے۔؟“

”میرے سوالوں کے جواب تمہارے پاس ہوتے ہیں۔ تمہارے نزدیک شادیاں کیوں ٹوٹتی ہیں۔“

”جن شادیوں سے احساس ختم ہو جاتا ہے، وہ شادیاں سڑ جاتی ہیں۔ اور پھر جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ جب

شوہر ہر بات پہ بیوی پہ چیختا چلاتا ہے، کھانے میں نمک مرچ زیادہ ہونے پہ ذلیل کرتا ہے، یا پھر باہر

آنے جانے پہ پابندی لگاتا ہے۔ تب بیوی کو لگتا ہے شوہر کے دل سے محبت ختم ہو گئی ہے، حالانکہ اسکے

دل سے شفقت، نرمی، انسانیت ختم ہو گئی ہوتی ہے۔ بیوی کی بد زبانی، انگریز، نافرمانی پہ شوہر کو لگتا ہے

اب وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے کیونکہ اب محبت نہیں رہی۔ حالانکہ شادی سے understanding ختم ہو جاتی ہے۔"

"پھر شادیوں کو چلانے کے لئے کیا کیا جائے۔؟" تھکا تھکا استفسار کیا گیا۔

"اس سوال کے جواب کے لئے آپ کو انتظار کرنا ہوگا، میری شادی کو پچیس سال گزر جانے کا انتظار۔ پھر میں آپ کو کوئی معقول جواب دے سکوں گی۔" مہدی مسکرایا، زینیا بھی ذرا ذرا سا مسکرائی۔

"کافی پیسے ساتھ۔" مہدی کی پیشکش پہ وہ رکی۔

"ابھی میں آپ کے ساتھ اتنی فری نہیں ہوئی۔" مہدی زور سے ہنسا۔ "میں آج اپنے شوہر کے ساتھ کافی پیسے جاؤں گی۔" وہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئی، مہدی اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

نوٹ: یہ ناول ہمارے یوٹیوب چینل پر بھی وائس میں پوسٹ پورہا ہے۔۔۔ سننے کے لیے ہر تپج کے اختتام میں

Channel لکھے الفاظ پر کلک کریں اور خوبصورت آواز میں ناول کو انجوائے کریے شکریہ۔۔۔

گواہ کی نم ہوائیں آج عجیب سوگواریت لئے ہوئے تھیں۔ ان نم ہواؤں کو چھو کر، ٹھنڈی دھوپ سے بدن سینک کر حاکم نواب کے گھر میں آؤ تو آج حاکم نواب نے گھر سر پہ اٹھایا ہوا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو ایک رسید تھمائی تھی، جو کہ اب ان کو مل نہیں رہی تھی۔ حاکم نواب مکمل غصے میں آچکے تھے۔ اپنی بیوی اور بیٹیوں کی شان میں گالیاں بکتے ہوئے انکو یہ اندازہ نہیں تھا کہ گالیوں کی نوعیت کیا ہے، وہ اپنی ہی بیٹیوں کو کن کن القابات سے نواز رہے ہیں۔ کیا ان کی زبان یہ اجازت دے رہی ہے۔؟ کیا دل ملامت نہیں کر رہا۔

جامنی الماریوں والے کمرے میں کونج کالج کی وردی میں ملبوس فرش پہ بیٹھی تھی۔ سیاہ بال چٹیا سے نکل کر چہرے پہ پھسل رہے تھے۔ مڑی ہوئی پلکوں والی آنکھیں کسی غیر مرئی نکتے پہ جمی تھیں۔ ہر گالی پہ وہ آس پاس دیکھنے لگتی، کہیں بشر کی بیوی تو نہیں سن رہی، کہیں محلے سے کوئی آنہ جائے، کہیں ساتھ والے گھر آواز نہ چلی جائے۔ اسی لمحے اس کی گود میں پڑا موبائل تھر تھرایا۔ شاید زینیا ہو۔ ایک آس کے تحت اس نے موبائل اٹھا کر دیکھا، یہ وہی لڑکا تھا جس نے اسے کچھ روز قبل میسج کیا تھا۔ وہ آج ایک بار پھر میسج کر رہا تھا۔ اس بار وائس نوٹ بھیجا تھا۔ کونج نے مردہ، بے تاثر آنکھوں سے میسج دیکھا۔ ابا کی گالیاں یہاں تک سنائی دیتی تھیں۔

”میں نہیں جانتا تمہارا نام کیا ہے۔ لیکن تمہاری آنکھیں دیکھ کر لگتا ہے کہ اب ان کو نہ دیکھ سکا تو شاید مشکل ہو جائے۔ کیا کبھی کسی نے تمہیں واقعی نہیں بتایا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔“ وہ اتنا خوبصورت، اتنا ٹھہر ٹھہر کر بولتا تھا کہ اسے سنا جائے۔ بس اسی کو سنا جائے۔ وائس نوٹ ختم ہو گیا لیکن ابا کی آوازیں نہیں۔

”ساری زندگی میں تم سے کوئی فیض نہیں پاسکا۔ گالی گالی گالی ساری زندگی تم میرے سر

پہ عذاب کی طرح مسلط رہیں، تم ایک بوجھ ہو گھٹیا عورت ہو تم، تمہارے ماں باپ گھٹیا ہیں۔ تمہارے

سارے گھر والے گھٹیا ہیں۔ ”کیا واقعی وہ ساری زندگی کوئی فیض نہیں اٹھا سکا۔؟ وہ گرمی میں جھلس کر

بنائے گئے کھانے، وہ بیماری کے وقت کا خیال، وہ خدمت، وہ راتوں کو پاؤں دبانے۔ وہ غربت اور ہر قسم کی

معاشی تنگی میں ساتھ دینا وہ سب کیا تھا۔؟)

ادھ ٹوٹے ہینڈ فری کوکانوں میں لگائے، سر کو بیڈ پہ گرائے، اسکی آنکھوں سے آنسو روانہ ہو چکے تھے۔

کوئی اتنا مرد اتنا بد صورت کیسے بول سکتا ہے۔ کوئی باپ اتنا غیر کیسے ہو سکتا ہے۔ اسکے دل پہ اپنے باپ

کے خلاف گرہیں لگنے لگیں۔ اس نے نیم مردہ ہوتی آنکھیں ہلکی سی کھولیں۔ ابا کا شور ابا کی گالیاں اسکے

دماغ پہ ہتھوڑے کی طرح بج رہی تھیں۔ اس نے موبائل ہاتھوں میں اٹھا لیا اور ایک میسج ٹائپ کیا۔

”بولتے رہو . . . یونہی اچھا اچھا بولتے رہو پلیز۔ ”میسج سفر کرتا مطلوبہ شخص تک پہنچا۔ فوراً نیلے ٹک

لگے، آڈیو ریکارڈ ہونا شروع ہوئی اور پھر دھڑا دھڑا کئی سارے وائس نوٹ آنے کی نوید سنائی دینے لگی

۔ ادھ ٹوٹے ہینڈ فری ایک بار پھر آواز سن رہے تھے۔ آنکھوں سے بہہ چکے کا جل والی لڑکی بس اسے سن

رہی تھی۔

”جیسی تم بے حیا ہو، تم نے اپنی اولاد کی تربیت بھی ویسی کی ہوگی۔ جیسے تم نے مجھے زچ کیا ہے اسی طرح تمہاری اولاد اپنے شوہروں کو زچ کریں گی۔ تمہاری بیٹیاں طلاقیں لے کر آئیں گی۔“

”میری بیٹیاں آپ کی بھی بیٹیاں ہیں۔ اگر میری تربیت گندی تھی، تو شاید آپ کا اچھا خون اثر دکھا جائے۔“ اسکی ماں شاید مزید بھی کچھ کہنا چاہتی تھیں، لیکن اب صرف ابا کی گالیوں کی آواز نہیں آتی تھی، اب مارنے کی آواز بھی آتی تھی۔ اس کا باپ اسکی ماں کو مار رہا تھا اور یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔

”تم اتنی معصوم ہو، اتنی پیاری ہو کہ تمہارے ساتھ ساری زندگی اتنی خوبصورت گزر سکتی ہے جیسے جنت میں گزرے چند دن۔ کیا یہ رابطہ ہمیشہ رہے گا۔؟ میں یونہی بغیر کسی جواب کی توقع کئے بولتا رہوں گا۔ تمہیں پسند ہے ناں مجھے سننا۔؟ تم یقین کرو تم تعریفوں کے لئے بنی ہو، پرستش کے لئے بھیجی گئی ہو۔“ آواز بند ہوگئی تو باہر کی آوازیں ایک بار پھر اسکے سر پہ لگنے لگیں، وہ ان آوازوں سے پیچھا چھڑانا چاہتی تھی، ان سے دور کہیں بہت دور بھاگ جانا چاہتی تھی۔ لیکن آوازیں تھیں کہ جان نہیں چھوڑتی تھیں۔ اسکی آنکھوں کے آگے بھولے بھٹکے منظر بکھرنے لگے۔ ماضی ٹکڑوں میں ایک پزل کی طرح بکھر رہا تھا۔

(وہ ابا کے دوست کے گھر کسی دعوت میں شرکت کرنے آئی تھی۔ زینیا اور اماں بھی اسکے ساتھ تھیں۔

میزبان گھر نہیں ایک کنبہ تھا۔ ڈھیر ساری عورتیں انکے گرد بیٹھی تھیں۔ ہر ایک کی آنکھوں کا مرکز زینیا

حاکم تھی۔ اسکی خود اعتمادی، اسکا لوگوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا، شفاف رنگت، اور

ساحر آنکھیں۔ وہ سارے میں چھائی ہوئی تھی۔ کوئی کونج کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا، تعریفوں میں زینیا

تھی۔ ستائش کی وہ حقدار تھی۔ توصیفی کلمات اسکی شان میں کہے جانے تھے۔

وہ منتظر رہی کہ کوئی اسکی آنکھوں کی تعریف کر دے، کوئی اسکے بالوں، اسکی معصوم مسکراہٹ کی

تعریف کر دے۔ اسے بھی ستائش سے دیکھے۔ ہر انسان کو تعریف پسند ہوتی ہے۔ اسے اپنی بہن سے حسد

، جلن نہیں تھا۔ ہاں یہ وہ دور تھا جب کونج نے زینیا کا lesser version بننے کا سوچ لیا تھا۔ اور

پچھلے کئی سالوں سے وہ عمل کرتی آ رہی تھی۔ لیکن زمین زادوں نے آسمان کہاں دیکھا ہے۔)

وائس نوٹ ایک بار پھر آ چکے تھے۔ وہ لڑکا جو کوئی بھی تھا اسے بس کونج سے بات کرنی تھی۔ اسے بس

مزید بس مزید اس چہرے کو دیکھنا تھا۔ باہر سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں اب بھی آتی تھیں۔ بشر گھر آ

چکا تھا، اور اب وہ ابا سے جھگڑ رہا تھا۔ کونج اسے بھی نہیں سننا چاہتی تھی۔۔ وہ تھک چکی تھی۔

اس نے ایک بار پھر وائس نوٹ پہ پلے کا بٹن دبا دیا۔ ایک مخمور، دل کو چھو لینے والی آواز ایک بار پھر اسکی سماعتوں کا حصہ بننے لگی۔

”کیا میں تمہیں روز کال کر لیا کروں، کیا یہ ٹھیک ہے۔؟ کچھ بولو، کم از کم کچھ لکھ ہی دو۔ مجھے تمہارے جواب کا انتظار ہے۔ میں اب تک تمہاری آنکھوں کے سحر سے نہیں نکل سکا۔ کیا کسی نے تمہیں . . .

“ . . .

”یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔؟“ آواز صور کی مانند اسکے کانوں میں چبھی۔ کونج حاکم جہاں تھی وہیں تھم گئی۔ دروازے کی چوکھٹ پہ ضیغم میر کھڑا تھا۔ اسکی آنکھیں فکر مند تھیں، انداز چوکنا۔ جھگڑے کی وجہ سے عروج نے اپنی ماں اور بھائی کو بلا لیا تھا۔ باقی گھر والے اب بیٹھک میں تھے جب ضیغم نظر بچا کر یہاں چلا آیا۔

”تم ٹھیک ہوناں؟ کیا ماموں نے تمہیں مارا ہے۔؟“ وہ کتنی محبت، کتنی نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ کونج نے نفی میں سر ہلایا، اسی لمحے اسے احساس ہوا اسکا چہرہ گیلا ہے۔ موبائل اب بھی اسکی گود میں تھا سکرین

بجھ چکی تھی۔ ”کوئج . . . کیا تم واقعی ٹھیک ہو۔ دیکھو مجھے فکر ہو رہی ہے ماموں نے تمہیں مارا تو نہیں
 ”۔“

اسکی آنکھیں مزید روانی سے بہنے لگیں۔ اب کے ضیغم آگے بڑھ آیا۔ فرش پہ پڑا اسکا بیگ اٹھایا
 ،موبائل ،اور باقی چیزیں اٹھا کر بیگ میں ٹھونس دیں۔ فرش کی نذر ہوا اسکا دوپٹہ اٹھا کر اسکی طرف
 بڑھایا۔ جسے کوئج نے کندھوں پہ پھیلا دیا۔ سترہ سالہ زندگی میں آج اس نے پہلی بار بشر کے علاوہ کسی
 مرد کو نرم ہوتے دیکھا تھا۔ وہ پنچوں کے بل اسکے قریب بیٹھ گیا۔

”ہر گھر میں مسائل ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں جھگڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ان کو دل پہ مت لیا کرو۔ تم بہت
 قیمتی ہو۔ یوں خود کو بے قدر مت کیا کرو۔“ وہ گیلی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی ،اسے خود سے شرم
 آئی۔

وہ کس طرح ایک غیر ،انجان مرد کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ کتنی بری تھی۔ کتنی سیاہ تھی۔ ”میں اندر
 کمرے میں ہوں ،اپنا خیال رکھنا۔ پلیز۔“ وہ اسکے پاس سے اٹھا ،اسکا بیگ اٹھا کر پلنگ پہ رکھا۔ دروازے

تک جاتے جاتے وہ اسے نرم نظروں سے دیکھتا رہا۔ چوکھٹ پہ وہ رک گیا۔ قدرے شوخ انداز میں اسے دیکھا۔

”تم یہاں سے اٹھو گی نہیں تو میں جا نہیں سکوں گا۔ اور اگر بشر نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو میرا حشر نشر بگاڑ دے گا، اٹھ جاؤ پلیز۔“ کوچ نم آنکھوں سے کھکھلا کر ہنس دی۔ وہ چند لمحے اسے ہنستے ہوئے دیکھتا رہا پھر مڑ گیا۔ کوچ اپنی جگہ سے اٹھی، بال ہاتھوں سے پیچھے کئے، آنکھیں رگڑ کر صاف کیں۔ اور بیگ سے اپنا موبائل باہر نکالا۔ وہ بلاک کا بٹن دبا رہی تھی۔

دور کہیں اسکے اندر پچھتاوے کے ساتھ ایک خواہش بھی تھی۔ اگر اسے ماضی میں اپنے گھر سے تعریف، حوصلہ افزائی، توصیفی کلمات ملے ہوتے تو آج وہ ایسی نہ ہوتی۔ انسان کا ہر ایکشن اسکے ماضی میں ہوئے واقعے کا ری ایکشن ہوتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

رنگین دیواروں والا کینے آج ایک بار پھر ملاقاتیوں کے آنے کا شرف حاصل کر چکا تھا۔ بالاج آج قدرے بہتر تھا۔ زینیا سے چند ہلکی پھلکی باتیں کرنے کے بعد وہ اب اس کے زخم کے متعلق استفسار کر رہا تھا۔

”آئی ایم سوری کل میں پریشانی میں پوچھنا بھول گیا۔ تمہارے چہرے پہ کیا ہوا ہے۔“

”کچھ خاص نہیں، بس چھوٹا سا حادثہ تھا۔ آپ بتائیں کہیں کھانا کھانے چلیں۔؟“

وہ آہستہ آہستہ کمفر ٹیبل ہونا چاہتی تھی۔ کھانے کی بات پہ بالاج کی آنکھوں کی جوت بجھ سی گئی۔ اس نے نامحسوس انداز میں اپنی جیبیں تھپتھپائیں۔ زینیا غور سے اس کی ایک ایک حرکت نوٹ کر رہی تھی۔

”کل چلیں۔؟ آج میرا موڈ نہیں ہے۔“ اس کی آواز ہلکی تھی۔ زینیا پر تکلف سا مسکرائی۔

”ایسا کرتے ہیں کل میں آپ کو اپنے ہاتھ سے کچھ بنا کر کھلاؤں گی۔ آپ بتائیں آپ کو کیا پسند ہے۔“ وہ آگے کو ہو کر بیٹھی، چہرہ پر جوش تھا اپنے اپنے شوہر کا بھرم وہ رکھ چکی تھی۔

”مجھے مٹن کڑا ہی بہت پسند ہے۔ بیف کو فٹے اور مٹن قورمہ تو میرا فیورٹ ہے۔ تم بتاؤ تم کل کیا بنا رہی ہو۔“ وہ بھی یکدم پر جوش ہو گیا تھا۔ زینیا نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"آپ کو چکن پسند نہیں ہے کیا۔؟"

"چکن میں کیا رکھا ہے۔ نہ مزہ، نہ طاقت، نہ جان۔ مرد بیف اور مٹن سے نیچے بات نہیں کرتے۔

"بالاج بد مزہ ہوا۔

"اور مجھے چکن کے علاوہ کچھ پسند نہیں۔"

"جب ہی تو یہ حالت ہے۔" بالاج دوبارہ بولا۔ "خود کو دیکھو وزن کتنا کم کر لیا ہے۔ سارا وقت پڑھائی کی

ٹینشن، پھر کھانے میں یہ چکن اور ساری دنیا کا بوجھ اپنے کندھے پہ یہ حالت تو ہونی ہے۔ اب فکر نہ کرو

، میرے ہاتھ آگئی ہو اچھا خاصا کھلا پلا کر تمہارا وزن بڑھا دوں گا۔"

"ایسی بھی بات نہیں، اچھا خاصا وزن ہے میرا۔ آپ مردوں کو بس بیف اور مٹن کے شوق میں کچھ

نہیں دکھتا۔ اچھا یہ بتائیں کل قورمہ بناؤں، یا پھر کوفتے۔؟" بالاج آگے کو ہوا، مسکراتی نظروں سے اسے

دیکھا۔

”جو تم میرے ساتھ کھانا پسند کرو۔ چاہے پھر وہ بے جان مرغی ہی کیوں نہ ہو۔“ وہ مسکرایا تو زینیا اسکے ساتھ مسکرائی۔ ”تم بہت اچھی ہو زینی۔ باتیں مان جاتی ہو۔ بچپن میں ایسی نہیں تھی تم۔ اللہ معاف کرے گاؤں کے لڑکوں کو بھی مارتی تھی۔ اور بیچارہ بشر الزام اپنے سر لے لیتا تھا۔“

”آپ کون سا کم تھے۔ مجھے یاد ہے راجا چچا کا بیٹا آپ سے جھگڑا کر گیا تھا۔ آپ نے اسے ٹیوب ویل میں کتنی ڈبکیاں دلوائیں۔ بہت ظالم تھے آپ۔“

”شرم کرو۔ وہ لڑکوں کا ٹیوب ویل تھا۔ تم وہاں سے بھی باز نہیں آئیں۔“ بالاج نے اسے شرم دلانی چاہی۔

”لڑکوں کو ٹیوب ویل فصل کے پانی کے لئے دیا گیا تھا۔ اپنے ذاتی جھگڑے میں استعمال کرنے کے لئے نہیں۔“ وہ بھی بلا کی ڈھیٹ تھی۔ بالاج کے ہونٹوں سے آج مسکراہٹ جدا نہ ہوتی تھی۔

”تمہیں بچپن کتنے اچھے سے یاد ہے۔ میں کافی باتیں بھول گیا ہوں۔ میں“ یکدم وہ بولتے بولتے رکا۔ آنکھوں میں پہلے حیرت، پھر شاک، پھر بے چینی، اور پھر زخمی پن اترآ۔ چند لمحوں میں اسکی آنکھوں نے جذبات کے مختلف سمندر عبور کئے۔ زینیا جو مسکرا کر توجہ سے اسکی بات سن رہی تھی۔ اسکے

خاموش ہونے پہ ٹھٹھی، پھر اس نے بالاج کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ اسکی خالی انگلی کو دیکھ رہا تھا۔

”تمہیں بچپن بہت اچھے سے یاد ہے، صحیح کہتی ہو۔ یعنی پھر بچپن میں جڑے رشتے بھی یاد ہوں گے ہے ناں۔“ زینیا نے ہاتھ کی مٹھی بھیج لی۔ ”تم اسے بھولتی کیوں نہیں ہو زینیا۔؟ نہ تم نے اسے دیکھا نہ سنا۔ اور ایک میں ہوں جو تمہارے لئے بولتا ہوں، تمہیں سنتا ہوں، تمہیں دیکھتا ہوں۔ کیا میں یہ ڈیزرو کرتا ہوں کہ تم مجھے یوں دھوکہ دو۔؟“

”آپ نے کیوں عبداللہ کو اپنے حواسوں پہ سوار کر لیا ہے۔؟“

”کیونکہ تم نے اسے اپنے دل پہ سوار کر لیا ہے۔“ زینیا کے دل میں پھانس سی چبھی۔ آنکھیں زخمی ہوئیں۔ ”وہ صرف ایک انگوٹھی تھی بالاج۔“

”وہ صرف ایک انگوٹھی نہیں تھی وہ کمٹمنٹ تھی۔“ یکدم وہ میز پہ ہاتھ مار کر چیخ کر بولا تو زینیا ٹھہر سی گئی۔ آس پاس لوگوں نے مڑ کر دیکھا۔

”لیکن تمہیں کیا معلوم انگوٹھی کیا ہوتی ہے۔ تمہاری انگلی تو تیسیس سال ایک رشتے کے باوجود خالی رہی ہے۔ تمہیں کیا معلوم کمٹمنٹ کیا ہے تمہیں تو فون کال کرنے پہ بھی رد کر دیا جاتا ہے۔“ اب کے زینیا کی آنکھیں شک سے پھیلیں۔ وہ کیسے جانتا تھا۔ اسکی آنکھیں گیلی ہونے لگیں۔ لب ہلکے سے وارہ گئے۔

”وہ بس ایک انگوٹھی تھی۔“ زینیا کی آواز کہیں دور سے آتی تھی۔ آنکھیں شاکی، چہرہ سفید۔ ”میرے ہاتھ میں چھ رہی تھی، مجھے عادت نہیں ہے۔ میں“ وہ ہلکے کانپتے لہجے میں صفائی دے رہی تھی۔

لوگ انکی جانب متوجہ تھے۔ وہ کسی کو نہیں دیکھ رہا تھا۔

”وہ میری تصحیح کرے تذلیل نہیں۔“

”ظاہر ہے چھبے گی ہی تم تو عادی ہونا منگنی کے باوجود خالی انگلی کی۔ تم تو عادی ہو ذلت کی۔“ زینیا کا چہرہ اب کے سرخ ہوا تھا۔ اس نے دانت پہ دانت جما کر صبر کیا۔ ”تم ایک رد کی ہوئی عورت ہو۔ کئی سال ایک بے جوڑ، بے نام، اور بے زیور رشتے میں رہنے والی لڑکی ہو۔ کمٹمنٹ، رشتہ، قید یہ سب تمہیں کیسے سمجھ آئے گا۔ تمہیں کسی کا حق جتنا، کسی کا پازیسو ہونا، اپنے نام کے ساتھ ایک محفوظ نام

جوڑا جانا کیسے سمجھ آئے گا۔ تم تو وہی ہونا جس نے عبداللہ کے لئے تینیس سال خاندان کی باتیں سنی، انتظار کیا اور پھر نا مراد ہوئیں۔"

”وہ میری تصحیح کرے تذلیل نہیں۔“

بالاج آگے کو ہوا۔ اسکی آنکھوں میں دیکھا۔ وہ کناروں سے گیلی تھیں، سرخ اور کرب زدہ بھی۔ ”تم اب تک اپنے عبداللہ فیر سے باہر نہیں آئیں ناں۔؟ تم اب تک خود کو ایک آزاد عورت سمجھتی ہو۔ تمہیں محبت اور شادی کی من پسند قید سمجھ نہیں آتی۔ تم ایسی کیوں ہو زینیا۔؟“ زینیا کو اس کی آنکھوں میں ایسی حقارت نظر آئی جیسے کسی کوٹھے والی کے لئے بھی نہ ہوتی ہو۔

زینیا نے سارے کے سارے آنسو اندر اتارے۔ آنکھیں ایک بار پھر ملکہ بد کی آنکھیں ہوئیں۔ ”نہ تم مجھے خرید کر لائے ہو، نہ میں تمہاری زر خرید غلام ہوں، اور نہ ہی تم وہ شوہر ہو جس کے لئے میں نے خواب دیکھے ہوں۔ ہم دونوں کی شادی معاہدہ ہے۔ میں یہاں تمہارے ساتھ ہوں، تو تمہاری بہن میرے بھائی کے ساتھ ہے بھولنا مت۔“ وہ انگلی اٹھا کر وارن کر رہی تھی۔ لہجہ بلند نہیں تھا۔ مگر ہلکا بھی نہیں تھا۔

۔ ”وٹے سٹے کی شادیوں میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے تم بھی واقف ہو اور میں بھی۔ اس لئے بالاج

یوسف میر - "وہ دونوں ہاتھ میز پہ رکھے آگے کو جھکی۔" میرے ساتھ تمیز سے پیش آؤ۔ مجھے طعنے مت دو۔ اور میری عزت کرو۔ ورنہ میری ایک فون کال تین تین گھر برباد کرے گی اور تم جانتے ہو میں ایسا کر سکتی ہوں۔"

"تم مجھے دھمکی دے رہی ہو۔؟ ڈرا رہی ہو مجھے۔" اس نے بازو سینے پہ باندھے تندہی سے پوچھا۔ آس پاس سے بے نیاز وہ دو بدو تھے۔

"جو تم سمجھو۔ معاہدے کی شادی میں ڈر بھی رکھو، خوف زدہ بھی رہو، پابند بھی، اور تمیز دار بھی۔ ورنہ اگر یہی عمل وہاں گواہ میں دہرایا گیا تو تمہیں برا لگ جائے گا۔" کہتے ہوئے اس نے جھپٹ کر بیگ اٹھایا، ایک سخت جتاتی نظر بالاج پہ ڈالی اور کیفے سے باہر نکل گئی۔

بالاج چاہے جو مرضی کر لیتا، حقیقت یہی تھی کہ اس ایک شادی سے کئی اور تعلق جڑے تھے۔ جن کو توڑنا فلحال اسکی جرات نہ تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سرخ بس میں سوار وہ افسردگی سے کھڑکی سے ماتھا ٹکائے ہوئے تھی۔ روشنیاں، کھانے کی خوشبو، کافی شاپس اور سڑک کے اطراف میں چلتے پھرتے لوگ آج بھی پہلے جیسے تھے۔ اگر کچھ بدلا تھا تو زینیا حاکم کا چہرہ۔ وہ بالاج سے ملنے خوشی خوشی گئی تھی، واپسی ویسی نہیں تھی جیسی اس نے چاہی تھی۔ کئی بار انسان اپنی بنائی فینٹسی میں اتنا آگے چلا جاتا ہے کہ حقیقت اسے غیر حقیقی لگنے لگ جاتی ہے۔

چلتی بس ایک جگہ رک گئی تھی۔ سامنے سڑک پہ کسی امیر زادے کی لمبی گاڑی خراب کھڑی تھی۔ کنڈیکٹر اب اسے بڑی شان سے اپنی بس میں بٹھا رہا تھا۔ زینیا یونہی ماتھا شیشے سے ٹکائے بیٹھی رہی۔ امیر زادے کے آنے سے بس میں دبا دبا جوش بڑھ گیا تھا۔ آوازیں اسکے کانوں میں پڑ رہی تھیں۔ وہ بے حس بیٹھی رہی۔ اسکے پاس اس اسپیکر سے زیادہ بڑے مسائل تھے۔ چند لمحوں بعد اسے اپنے قریب حرکت محسوس ہوئی، کسی نے دو سیٹوں کے درمیان ایک بیگ رکھا تھا، تاکہ فاصلہ ہو سکے۔ اس کے آنے سے آس پاس مہنگی خوشبو پھیل گئی۔

”سرکار شیشہ لگ جائے گا۔“ سبز آنکھوں والے مرد کی ہلکی آواز پہ بھی وہ نہیں مڑی۔ بس یونہی بے حس و حرکت شیشے پہ ماتھا گرائے، سیٹ پہ آگے کو ہوئی بیٹھی رہی۔

”جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے تم ایک حلال ڈیٹ پہ گئی تھیں۔ پھر ایسا کیا ہوا کہ یوں حرام شکل بنائے بیٹھی ہو۔“

وہ اپنے موبائل پہ انگلیاں چلاتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ایک دنیا تھی جسے مہدی کمبیر کو جاننا تھا، سننا تھا، اسکے مسائل حل کرنے تھے، اپنے مسائل اسے سنانے تھے۔ لیکن وہ یہاں اس بس میں بیٹھا اسکے مسئلہ جاننا چاہتا تھا، جو سیدھے منہ جواب بھی نہیں دیتی تھی۔ بچارے مرد۔

”جھگڑا ہوا ہے۔؟ وجہ کیا تھی، دوسری عورت، اسکی کنجوسی، یا پھر تمہارا ڈھیٹ پن۔“ اس نے ایک بار پھر کریدا۔

”شک کرتا ہے مجھ پہ۔“ اسکی آواز ہلکی تھی، بے حد ہلکی۔ دور کہیں کرب زدہ بھی۔

”اسے لگتا ہے میں آج بھی اپنے ماضی کو یاد رکھے ہوئے ہوں۔ حالانکہ میں ماضی بھلا نہیں سکی تو اس پہ بے حس ضرور ہو چکی ہوں۔“ زینیا حاکم وہ لڑکی نہیں تھی جو یوں بس میں بیٹھے اپنا حال سنا دے۔ لیکن اس وقت اسکے جسم، دماغ، اور دل پہ بہت بوجھ تھا۔ وہ اس سے چھٹکارہ چاہتی تھی۔ انسان کئی دفع اپنی پرسنالٹی کر برعکس بھی کام کر لیا کرتے ہیں۔

”میں اپنے ہر عمل سے اس کو خوش کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن وہ میرا ماضی نہیں بھولتا۔ میں چاہتی ہوں وہ بھول جائے، میں بھی بھول جاؤں۔ میرا اور میرے شوہر کا تعلق بچ جائے، باقی سب ختم ہو جائے۔“ وہ گویا اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

”تمہاری کوشش غلط ہے۔ تم ماضی کو اپنی زندگی سے نکلنے میں ہلکان ہوئی جا رہی ہو لیکن حقیقت یہی ہے کہ تم آج بھی اس سے نکل نہیں سکیں۔ کوئی انسان نہیں نکل سکتا۔“ زینیا نے تھکن سے آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اتنا سچ کیوں بولتا تھا۔؟ کاش کوئی اس کا منہ بند کروا دے۔

”تمہیں آج بھی اپنا ماضی یاد ہے۔“

”مجھے وہ شخص ازبر ہے۔“ وہ بڑبڑائی۔ آواز مہدی کے کانوں تک نہیں گئی۔

”تم گلی ہو زینیا۔ تم کوشش کر رہی ہو کہ اپنے شوہر کے سامنے نارمل رہ سکو، ماضی سے بہت دور۔ تم اپنے تعلق میں کوشش کر رہی ہو، لیکن غلط۔ انسان اور اسکا ماضی ہمیشہ ساتھ رہتے ہیں۔“ الفاظ اسلام آباد کی ہواؤں میں امر ہو گئے۔

”take it easy تم ماضی کو کھرچ نہیں سکتیں۔ شادی میں اگر تمہیں ماضی یاد آتا بھی ہے تو اس میں گلٹی ہونے کی ضرورت نہیں۔ سوچوں پہ انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔“

”میرا بھی نہیں ہے۔“ وہ کھڑکی سے ماتھا ٹکائے زیر لب بولی۔ اسکی آواز زکام زدہ تھی۔ زینیا حاکم ہرٹ ہوئی تھی۔ حد سے زیادہ ہرٹ۔

”کیا تم ماضی میں واپس جانا چاہتی ہو، یا اپنے حال میں خوش ہو۔؟“

”میں بالاج کے ساتھ خوش رہنا چاہتی ہوں۔ واپسی کے خیال کو میرے دل نے ہمیشہ رد کیا ہے۔“ اب کے اسکی آواز مہدی کے کانوں میں پڑی۔ وہ ہنوز ٹائپ کر رہا تھا۔ اسکے چہرے پہ سکریں کی روشنی پڑ رہی تھی۔ بس میں چلتی سرخ بتی اور سکریں کی روشنی مل کر ایک الگ ہی دنیا بنا رہی تھیں۔

”تمہاری loyalty یہیں سے ثابت ہو جاتی ہے۔ اب خود کو مزید مت تھکاؤ۔ تم غلط نہیں ہو، برا ماضی خوشحال مستقبل کی راہ میں ضرور آتا ہے۔ ٹاکسک ایکس یو نو۔“ زینیا خاموش ہو گئی۔ جیسے سارے جواب مل گئے ہوں۔ مہدی بھی چند پل خاموش رہا۔ پھر اسکی آواز ابھری۔

”تمہارے کس عمل نے اسے ٹرگر کیا۔؟“ زینیا نے خاموشی سے اپنا ہاتھ اسکے آگے کیا۔ رنگ فنگر پہ زخم تھا۔ گول دائرے میں بنا زخم۔ کھال ادھڑ چکی تھی۔

”میں نے اس کی دی ہوئی انگوٹھی اتار دی۔“

”یہ تو پھر واقعی غلط کیا۔ لیکن اس نے تم سے زیادہ غلط کیا۔ اسے تصحیح کرنی چاہیے تھی، تذلیل نہیں۔“ زینیا نے ایک جھٹکے سے گردن موڑ کر اپنے ساتھ بیٹھے آدمی کو دیکھا۔ وہ اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ زینیا کو لگا وہ شخص شاید اسے اندر تک جان گیا تھا۔ کئی لمحے وہ سانس لئے بغیر اسے دیکھے گئی۔ اسے اس شخص سے خوف آیا تھا۔

”شادی کے شروعاتی دنوں میں، چاہے شادی کے دس سال بعد تک مرد اپنے دیئے ہوئے تحفات کے معاملے میں پازیسو ہوتا ہے۔ وہ کبھی نہیں چاہتا کہ اس کی بیوی اسکے تحائف کی ناقدری کرے، گو کہ تم نے نہیں کی۔ لیکن میں نے کہا ناں ماضی کئی بار خوشحال مستقبل کی راہ میں آجاتا ہے۔ کچھ چیزیں تم بدل لو، کچھ وہ، اچھی کٹ جائے گی۔“ سادہ، مخلص اور نرم لہجہ۔

”میں ہر بار اسکی برداشت کرتی رہوں گی تو اسکی امیدیں بڑھ جائیں گی، اور تعلق خراب ہوگا۔“

”تم اسکی نہ مان کر بھی تعلق خراب کرو گی۔ غصے میں، ضد میں نقصان بس تعلق کا ہوتا ہے، اسے سمجھاؤ، تسلی سے، نرمی سے شادی کے شروع میں ایک دوسرے کو وقت دو، فاصلے نہیں۔“

زینیا نے اب کے جواب نہیں دیا۔ وہ اگلے انسان کو تب تک سن سکتی ہے، جب تک وہ اسکے حق میں بولے۔ سچ کڑوا ہوتا ہے، اور اسے کڑواہٹ پسند نہیں تھی۔ بس اگلے اسٹاپ پہ آ کر رکی۔ مہدی اسے دیکھے بغیر اتر گیا، آدھی سے زیادہ بس خالی ہو چکی تو زینیا بھی بیگ کو کندھے پہ ڈالے تھکے تھکے انداز میں باہر آئی۔ ہاسٹل کی گلی آج خالی خالی تھی۔ نہ جانے مہدی بھی اتنا جلدی کہاں غائب ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ جا سکتا تھا۔ لیکن وہ ”ناں“ کو سمجھتا تھا۔

ہاسٹل آ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں آئی تھی۔ بیگ اتار کر فرش پہ پھینکا۔ اسی لمحے موبائل بجنے لگا۔ اسکی روم میٹ ذرا فاصلے پہ کھڑی ٹک ٹاک بنا رہی تھی۔ زینیا نے موبائل کان سے لگا لیا۔

”کوئج فلحال بات نہیں کر سکتی میں۔“ اس نے پہلا جملہ یہی کہا تھا۔ آگے سے شاید پریشانی سے کچھ استفسار کیا گیا۔

”کچھ نہیں ہوا۔ بس بالاج اور میرا چھوٹا سا جھگڑا ہو گیا ہے۔ نہیں اماں کو مت بتاؤ میں دیکھ لوں گی، ہاں اب فون رکھو۔“ بے زاری سے کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔ کچھ دیر یو نہی پڑے رہنے کے بعد وہ اٹھ بیٹھی۔ دراز سے وہی سونے کی انگوٹھی باہر نکالی۔ پھر اپنا ہاتھ دیکھا۔ لمبی سفید انگلیاں، لمبے ناخن، اور نیلا نیل پینٹ۔ چند لمحے وہ یو نہی اپنے خالی ہاتھ کو دیکھتی رہی، پھر اس نے انگوٹھی اپنی انگلی میں پہن لی۔ ذرا سی جدوجہد، ذرا سی تکلیف۔ لیکن کمٹمنٹ بعض دفع تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ اس نے مان لیا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ بلند کر کے دیکھا، کئی لمحے خالی خالی نظروں سے وہ اپنی انگلی کو دیکھتی رہی۔ پھر اپنا موبائل اٹھا کر ایک تصویر اتاری۔ اب کے اس کے ہاتھ تیز تیز موبائل پہ انگلیاں چلا رہے تھے۔ واٹس ایپ سٹیٹس پہ اب اسکا انگوٹھی والا ہاتھ تھا۔

”کئی بار کمٹمنٹ تکلیف دہ ہوتی ہیں۔ لیکن انسان انکا عادی بن جاتا ہے اگر وہ چاہے۔“ اس نے خود کو ایک بار پھر پلنگ پہ گرا دیا۔ تقریباً آدھا گھنٹہ بعد اسے کوئی لڑکی بلانے آئی تھی۔ باہر اس سے کوئی ملنے آیا تھا۔ زینیا حیرت سے باہر آئی۔ ہاسٹل کے گیٹ سے ذرا فاصلے پہ اسے حیرت کے شدید جھٹکے لگے تھے۔ بالاج گیٹ کے باہر یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہا تھا۔ زینیا کو دیکھ کر وہ رکا۔ رنگت ذرا سی بحال ہوئی۔ وہ بے چینی سے آگے بڑھ آیا۔

”میں تمہیں کیفے کے باہر ڈھونڈ رہا تھا۔ زینی تم کہاں چلی گئی تھیں۔ میں دو گھنٹے سے پاگلوں کی طرح تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ وہ فکر مندی سے کہہ رہا تھا۔ سٹریٹ پولز کی روشنی میں اس نے زینیا کا بے تاثر چہرہ دیکھا۔ پھر دھیرے سے پہلو میں گرا اسکا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

”تمہیں میرے لئے تکالیف جھیلنے نہیں دوں گا۔ کمٹمنٹ یہ انگوٹھی نہیں تمہارا ساتھ ہے۔ آئی ایم سوری زینی۔“ وہ واقعی پریشان تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی اتاری اور پھر زینیا کی انگلی میں پہنا دی۔ وہ زخمی کر دینے والی انگوٹھی اب ہاتھ سے اتر چکی تھی۔ یہ انگوٹھی کھلی تھی، آزاد اور بس آزاد۔

”میں کچھ پریشان ہوں زینی۔ بس میری کچھ باتیں نظر انداز کر دیا کرو، یا پھر میری اصلاح کر دیا کرو۔ میں تمہیں کھونا نہیں چاہتا کسی قیمت پہ نہیں۔ تم اب ٹھیک ہونا۔“ وہ کہتے کہتے رکا۔ متذبذب سی نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ زینیا چند لمحے اسے دیکھتی رہی، پھر مسکراہٹ دبائے اپنا ہاتھ اسکے سامنے کیا۔ انگوٹھی اتنی کھلی تھی کہ انگلی سے نکل جانے کا خدشہ تھا۔ بالاج نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ ”میں اس وقت اتنا کنگال ہوں کہ نئی رنگ بھی نہیں دلا سکتا۔“ اس نے زینیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔ انگوٹھی واقعی کھلی تھی۔ بے حد کھلی۔ ”یہ تو واقعی مسئلہ ہو گیا ہے۔“ وہ فکر مند ہوا۔ زینیا نے مسکراتے ہوئے اپنا ہاتھ

چھڑوایا۔ پھر گلے میں پہنی چین اتاری۔ انگوٹھی چین کے اندر ڈال کر اب وہ چین گلے میں پہن رہی تھی۔
 - بالاج ہنستے ہوئے اسے دیکھتا رہا۔ انگوٹھی اب چین میں لپٹی اسکے گلے میں چمک رہی تھی۔

”مسائل سے پہلے میرے پاس حل آتے ہیں۔“ وہ مسکرا کر جتا رہی تھی۔ بالاج زور سے ہنسا۔ وہ واقعی
 محفوظ ہوا تھا۔ چند پل وہ یونہی کھڑا رہا، پھر زینیا نے اسے جانے کو کہا۔ کچھ لمحہ بعد وہ پلٹ رہا تھا۔ زینیا
 مسکراتے ہوئے اسے ہاتھ ہلا رہی تھی۔ انگوٹھی اب بھی گلے میں پڑی چین میں دمک رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہاسٹل واپس آنے پہ اسے ایک بار پھر کوفت ہوئی۔ لڑکیوں کا ٹولہ یہاں سے وہاں گھوم رہا تھا۔ کچھ محفل
 لگائے بیٹھی تھیں، کچھ ساتھ بیٹھی کوئی فلم دیکھ رہی تھیں۔ ہاسٹل ہر وقت بھرا بھرا رہتا تھا۔ یہاں
 پرائیویسی بہت کم تھی۔ یا بس اپنے کمرے تک محدود تھی۔ وہ سیڑھیوں کی مدد لیتی اوپر اپنے کمرے کی
 طرف جا رہی تھی جب اسے کسی نے پکارا۔

”تمہاری اور تمہارے شوہر کی صلح ہو گئی کیا۔؟“ زینیا کرنٹ کھا کر مڑی۔

اسکی روم میٹ سوال کرنے والی لڑکی کے عقب میں کھڑی تھی۔ تمام لڑکیاں اسی طرف متوجہ تھیں۔
تماشا کسے پسند نہیں ہوتا۔؟

”دیکھو زینیا شادی کے شروعات میں مسائل تو ہوتے ہی ہیں۔ ٹو بی آنسٹ تم ہماری دوست ہو اس لئے صبر اور تحمل سے کام لینا سیکھو۔“ اسے پکارنے والی لڑکی ماہم اب بھی مصنوعی فکر مندی سے کہہ رہی تھی۔ زینیا کا چہرہ غصے سے سرخ ہونے لگا۔ اسے اپنے مسائل کا اشتہار لگایا جانا ہر گز پسند نہیں تھا۔ اور اس وقت وہ موضوع محفل تھی۔ اس نے آس پاس نگاہ دوڑائی۔ شیزل ہاتھ میں کالڈ کافی کا گگ لئے کھڑی تھی۔ آنکھیں محفوظ کن اندز میں پھیلی ہوئی تھیں۔ جیسے کہہ رہی ہو۔ ”لڑو زینیا حاکم۔“

”مجھے میرے پرسنلزم میں دخل ہونے والے لوگ بالکل پسند نہیں۔ آئندہ خیال رکھئے گا۔“ بس اتنا صرف اتنا کہا تھا اس نے اور پھر واپس مڑ گئی۔ اور ہال میں کھڑی ساری کی ساری لڑکیوں کے چہرے پہ جو مایوسی آگئی تھی اسکے پھر کیا ہی کہنے۔ یہاں کھڑی ہر لڑکی ایک جھگڑے کے لئے تیار تھی۔ لیکن زینیا حاکم اس وقت کوئی جھگڑا افورڈ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ سیڑھیاں چڑھتی اوپر آئی۔ کمرے میں داخل ہو کر دروازہ آہستہ سے بند کیا۔ بند دروازے کے پار اب کے اس کے چہرہ مختلف تھا۔ آنکھیں خون چھلکا رہی تھیں

۔ غصے سے اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ اسے زور زور سے چیخنا تھا۔ وہ جب تک چیخے گی نہیں اسکا غصہ ختم نہیں ہوگا۔

باتھروم کی طرف جاتے ہوئے اس نے جبرے بھینچ رکھے تھے۔ اندر آ کر اس نے دروازہ بند کیا۔ شاور کھول دیا، واش بیسن کا نل کھولا۔ اور باقی بھی سارے نل کھول دیئے۔ چند لمحے وہ یونہی واش بیسن پہ جھکی رہی، اور پھر اتنی زور سے چیخی کہ گردن کی نیسیں تک باہر آنے لگیں۔ دیوار پہ مکے مارتے ہوئے وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ وہ کونج حاکم نہیں تھی، جو باتیں دل میں رکھ لے وہ زینیا حاکم تھی ایک کی دس سنانا اسکا محبوب پیشہ تھا۔ جب تک اپنے خلاف بولنے والوں کی وہ زبان نہ کھینچ لیتی سکون زینیا حاکم پہ حرام تھا۔

پانی کی بہتی دھار میں اسکی آواز دب رہی تھی۔ کوئی اس کے راز کیسے استعمال کر رہا تھا۔ کوئی کیسے اسے موضوع گفتگو بنا رہا تھا۔ کوئی کیسے اس پہ ہنس سکتا تھا۔ اور وہ واپس کیسے آگئی وہ انکا منہ توڑے بغیر واپس کیسے آگئی۔ بری طرح چیختے ہوئے اس کا حلق دکھ رہا تھا۔ پھر اگلے چند لمحوں میں وہ پر سکون ہونے لگی۔ ہتھیلیاں سرخ ہو گئی تھیں۔ جسم کا سارا خون چہرے پہ سمٹ آیا تھا۔

وہ واش بیسن پہ جھکی بہتی دھار کے نیچے ہاتھ پیالے کی صورت پھیلا لئے۔ اب وہ پانی کے چھینٹے اپنے منہ پہ مار رہی تھی۔ زخم جل رہا تھا۔ تکلیف حد سے سوا تھی۔ وہ ضبط کرتے ہوئے باہر چلی آئی۔ شیزل اسکے کمرے میں غصے سے چکر کاٹ رہی تھی۔

”یہ کیا بکواس تھی ہاں۔ منہ کیوں نہیں توڑا اس کا۔؟ میری باری پہ تو پھاڑ کھانے کو آتی ہو ناں اسکی باری پہ کیوں زبان تالو سے چپک گئی تھی۔؟“ دہلی پتلی لڑکی سخت طیش زدہ تھی۔

زینیا کیلے چہرے اور نم آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ ”اس نے میرے بارے میں اور کیا کیا کہا ہے۔؟“ پر سکون لہجے میں کہتی وہ اپنے پلنگ پہ آکر بیٹھی۔ شیزل نے ضبط کیا۔

”اس نے کہا کہ مس زینیا حاکم کا شوہر اس پہ شک کرتا ہے۔ اور آج یونیورسٹی میں اسے کسی لڑکے کے ساتھ دیکھ کر آگ بگولہ ہو گیا۔ اور مزید یہ کہ تم دونوں کا ایک بہت بڑا جھگڑا بھی ہوا ہے۔ اور بہت جلد وہ تمہیں چھوڑ رہا ہے، کیونکہ تم اسکی خاطر اپنے میل دوست کو نہیں چھوڑ سکیں۔“ بات پوری کر کے اب وہ زینیا کی طرف دیکھ رہی تھی۔ یوں گویا کہہ رہی ہو۔ ”اس کا منہ توڑنا بنتا تھا ناں۔؟“

”مہدی کسیر اور قیس کسیر بھائی ہیں۔ تم نے مجھے بتایا نہیں۔؟“ اس نے سوال بدل دیا۔ اب کے شیزل نے اپنی چھوٹی آنکھوں کو تھوڑا اور چھوٹا کیا۔

”میں نے تمہیں مہدی کے ساتھ جاتے دیکھا تھا۔ لیکن تم قیس کو کیسے جانتی ہو۔ ویٹ تم نے مجھے بتایا نہیں تم اس دن کس کے گھر گھس گئی تھیں۔؟“ وہ تجسس سے کہتی آگے آئی۔ زینیا کی پر سکون آنکھوں میں دیکھا۔ اور پھر چہرے پہ ہاتھ رکھ لیا۔

”مجھ سے ہر گز یہ مت کہنا کہ تم لوسفر سے ملی ہو۔ یعنی قیس اوہ مائی گاڈ . . لوسفر تمہیں گھر چھوڑنے آیا تھا۔ اس نے تمہاری مدد کی کانٹ بلیو اٹ۔“ جوش اور ایکسائٹمنٹ سے اسکی آواز بدل رہی تھی۔

”تم اسکے ساتھ نک نیم ٹرمرز پہ ہو۔ تم اسے جانتی ہو۔؟“ اسکی بات پہ شیزل ذرا دیر کو خاموش ہو گئی۔

”وہ میرے دشمن کا دوست ہے۔“ شیزل ہلکی آواز میں بولی۔ ”اور کالج میں میرا سینیئر تھا۔ شاید دوست جیسا یا شاید نہیں۔ میں اس سے کچھ بھی کہہ سکتی ہوں۔ وہ مجھ سے کچھ بھی مانگ سکتا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو مصیبت میں کال کر لیتے ہیں۔ لیکن سا لگرہ پہ نہیں۔ ہم ایک دوسرے سے لڑ سکتے ہیں۔ لیکن

اگر کوئی ہم سے لڑے تو اسے چیر پھاڑ سکتے ہیں۔ لو سفر، وائرس اور میں trio تھے۔ دنیا کا سب سے عجیب و غریب trio۔ ہم مہینوں بات نہیں کرتے۔ لیکن پھر جب ملتے ہیں تو ہماری انرجی سیم ہوتی ہے۔“ وہ مسکراتے ہوئے بتا رہی تھی۔ زینیا نے اسے پہلی بار یوں دل سے مسکراتے دیکھا تھا۔

”اس روز مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ گھر کسی قیس کمبیر کا ہے۔ اور وہ قیس مہدی کا بھائی ہے۔ قیس کیسا آدمی ہے۔؟“ آخر میں زینیا واقعی جاننا چاہتی تھی۔

”جتنی مدد وہ تمہاری کر چکا ہے اتنی تو اپنے باپ کی بھی نہیں کرتا۔“

”شاید اسے اپنا کوئی فائدہ نظر آیا ہو۔“ زینیا نے اس کی بات اچک لی۔

شینزل نے سر کو نفی میں ہلایا۔ ”اس نے اپنے ماضی کے زیر اثر تمہاری مدد کی ہوگی۔ اسلام آباد اس کے ساتھ مہربان نہیں رہا، یہاں کے لوگ اس کے ساتھ مخلص نہیں رہے۔“ زینیا نے پہلی بار شینزل کو کسی کے لئے اداس دیکھا تھا۔

”اس کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا۔؟“ زینیا آگے کو ہو بیٹھی۔ شینزل مسکرا کر اسکی طرف جھکی۔

”ہماری خوبیوں میں ایک اور خوبی، ہم ایک دوسرے کے راز نہیں کھولتے۔“

”اور اگر کھول دو تو۔؟“ زینیا پر سرار ہوئی۔ شیزل کی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ مسکراہٹ البتہ برقرار رہی۔ ”پھر ہم ایک دوسرے کو جان سے مار سکتے ہیں۔“ اسے اپنی ہی آواز کھوکھلی لگی۔

”تم کہتی ہو ماضی میں اس کے ساتھ کچھ برا ہوا ہے۔ لیکن وہ اتنا evil ہے۔ کوئی اس کے ساتھ کیا کر سکتا ہے۔؟“

"evils isn't born it's made"

شیزل جتا کر بولی تو زینیا نے بات پلٹ دی۔

”قیس کرتا کیا ہے۔؟“ یوں اسے قیس پکارنا اسے عجیب لگ رہا تھا۔ لیکن معلومات اسکے لئے ضروری تھیں۔

”ملک کے سب سے بڑا فیشن برانڈ "قیسم" کا مالک ہے وہ۔ ٹیکسٹائل انڈسٹری میں اس کا سکھ بولتا ہے۔ یہ اس کا خاندانی کاروبار ہے۔ جسے کئی سالوں سے وہ خود سنبھال رہا ہے۔“

”ان دونوں بھائیوں کا تعلق کیسا ہے۔؟“

”قیس نفرت کرتا ہے مہدی سے۔ اور وہ دونوں بھائی نہیں کزنز ہیں۔ دنیا کے سب سے انوکھے کزن
 - ”زینیا سوچ میں پڑ گئی۔ اسی لمحے اسکی روم میٹ کمرے میں داخل ہوئی۔ زینیا کو دیکھ اسکی رنگت زرا سی
 اڑی تھی، لیکن وہ کمال ڈھٹائی سے آگے بڑھ آئی۔ اپنے بیڈ پہ آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اور موبائل سیٹ
 کر کے سامنے رکھا۔ وہ ویڈیو بنانے کو تیار تھی۔ زینیا غور سے اسے دیکھتی رہی۔

”یہ لڑکی، مجھے اپنے کمرے میں نہیں چاہیے کل سے تم میری روم میٹ ہو۔“ ملکہ بد نے فیصلہ سنایا
 - سامنے کوئی کنیز تھوڑی تھی۔؟

”شیزل سیمسن ایک تحفہ ہے جو ہر ایک کو نہیں ملتا۔“ وہ ایک ایک لفظ پہ زور دیتی گئی۔ پھر رک کر
 زینیا کو دیکھا۔ ”اس سے لڑو . . میں تمہیں لڑتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہوں۔“
 زینیا مسکرائی۔ اور اپنے بستر پہ لیٹ گئی۔ ”زینیا ایسے نہیں لڑتی۔“ چادر سر تک تانتے ہوئے وہ پر سکون
 تھی۔

”میں نے تم جیسی بزدل عورت کہیں نہیں دیکھی۔ تمہیں چاہئے تھا اس سے لڑتیں اسکا منہ توڑ دیتیں
 - لیکن“

”زینیا ایسے نہیں لڑتی۔“ وہ دونوں بیک وقت بولی تھیں۔ شیزل منہ بگاڑ کر۔ اور زینیا مسکرا کر۔ دراز قد لڑکی کلمستی ہوئی باہر چلی گئی۔ اور زینیا نے مسکرا کر چھت کو تکا۔ پھر دھیرے سے دہرایا۔

”زینیا ایسے نہیں لڑتی۔“

☆☆☆☆☆☆

فجر کی اذانیں بلند ہوئیں تو سارے میں گویا نور پھیل گیا۔ ہاسٹل کے کمرے میں زینیا اپنے بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ گود میں لیپ ٹاپ تھا اور وہ اس وقت کوئی ہارر فلم دیکھ رہی تھی۔ ہارر فلم اور زینیا buddies تھے۔ لائٹس بند کر کے، پاپ کارن ساتھ رکھ کر آدھا کمبل خود پہ ڈالے اگر ہر ہفتے اس نے ہارر فلم نہ دیکھی، اور پھر دیکھ کر چار راتیں سکون سے سو نہ سکی۔ پھر وہ زینیا ہونے سے غداری کرے گی۔ فلم ختم ہو چکی تو اس نے کمبل پیروں سے ہٹایا، آج اتوار تھا اور اسکی چھٹی۔ وہ بالکنی میں چلی آئی۔ اکا دکا گھروں کی بتی جلی تھیں۔ ورنہ گلی سنسان تھی۔ صبح کے وقت اچھی سردی ہو جاتی تھی، وہ اپنی شال اوڑھے نیچے چلی آئی۔ آنٹی نماز پڑھ کر اب فارغ ہوئی تھیں، اور اب پارک جا رہی تھیں۔ یہ انکا روز کا معمول تھا۔ فجر سے ذرا دیر بعد وہ قریبی پارک چلی جاتیں۔ واک اور کسرت کرتیں اور پھر روشنی

ہونے سے پہلے واپس لوٹ آئیں۔ زینیا نے آنٹی سے کچھ تصاویر لینے کی اجازت لے کر انکے ساتھ چلنے کے لئے تیار تھی۔ اب وہ گلی میں انکے ساتھ چل رہی تھی۔ کئی بار اس نے رک کر کچھ تصاویر بھی لی تھیں۔ پارک آکر آنٹی اپنے کام میں لگ گئیں۔ کیونٹی کی چند اور عورتیں اور مرد بھی اسی طرف آنے لگے تھے۔ آنٹی اب انکے ساتھ تھیں۔

زینیا ایک سنگی بیچ پہ آکر بیٹھ گئی۔ کسی خیال کے تحت اس نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ وہ سامنے سے چلا آ رہا تھا۔ وہی جس نے اسکی گردن پہ پستول رکھی تھی۔ اور وہی جس نے اسے اپنے گھر کے راز دیئے تھے۔ اس کے کس تاثر پہ یقین کرے اسے سمجھ نہ آیا۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرایا تھا۔ اونہوں شناسائی، یا دوستی والی مسکراہٹ نہیں۔ وہ طنزیہ مسکرایا تھا۔ پھر آس پاس دیکھا اور پھر اپنے سینے پہ انگلی رکھی اور دوسرے ہاتھ سے بیچ کی طرف اشارہ کیا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔

”میں یہاں آجاؤں۔؟“

زینیا نے نفی میں سر ہلایا اور یہی تو اسے چاہیے تھا۔ وہ خراماں خراماں چال چلتا اسکے قریب بیچ پہ آکر بیٹھا۔ زینیا نا محسوس انداز میں بیچ کے آخری سرے پہ اٹک گئی۔

”گڈ مارنگ اسمگلر امید ہے آپ کا کام اچھا جا رہا ہو گا۔“

”گڈ مارنگ saverus امید ہے تم اس وقت میرا موڈ خراب نہیں کرو گے۔“

زینیا نے آس پاس نظر دوڑائی۔ کوئی اس طرف متوجہ نہیں تھا۔ پھر بھی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”بات کرنی ہے میرے ساتھ چلو۔“ قیس اسے اٹھ کر آگے جاتا دیکھتا رہا۔ وہ ذرا دور گئی تو وہ بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر اسکی تقلید میں قدم اٹھانے لگا۔ اب وہ دونوں جاگنگ ٹریک پہ تھے اطراف میں کھڑے اونچے درختوں نے انکی شناسائی کا راز چھپا لیا۔

”تم نے اس روز مجھے بچایا کیوں۔؟“ وہ اسکے ساتھ چلتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

”میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔ ہاں البتہ اگر تمہیں پکڑے جانے کا شوق ہے تو میں پولیس کو کال کر دیتا ہوں۔“

”تم مسلسل مجھے بچا رہے تھے۔ مجھے جاننے کا حق ہے کیوں۔؟“

”فکر مت کرو اتنی خوبصورت نہیں ہو کہ پہلی نظر میں تمہاری محبت میں مبتلا ہو جاؤں اور پھر تمہاری

مدد کرنے لگوں۔“ زینیا کے کان سرخ ہو گئے۔ وہ چلتے چلتے رک گئی۔ وہ اثر لئے بغیر اسے دیکھتا رہا۔

”کسی نے تمہیں تمیز نہیں سکھائی۔؟ کسی شادی شدہ عورت سے اس طرح بات کرتے ہیں۔؟“

”اپنے بارے میں کیا خیال ہے۔ کسی نے تمہیں نہیں سکھایا کہ تین کلو ڈرگز لے کر ایک شریف انسان کے گھر نہیں گھس جاتے۔“ زینیا کا جی چاہا تھا کاش وہ اسکا منہ نوچ سکتی۔ مگر۔

”تم اور شریف دو الگ الگ باتیں ہیں۔ جس طرح سے تم نے اس ساری صورتحال کو ہینڈل کیا۔ یوں لگا تھا تم پیدائشی شیطان ہو۔“ قیس کے چہرے پہ سایہ سا لہرایا۔ دیو قامت درختوں اس کے دل کے بو جھل ہونے کا راز سینے میں رکھ لیا۔

"Evil isn't born it's made"

ہلکی بے حد ہلکی آواز تھی اسکی۔ ماضی فلیش بیکس کی صورت آنکھوں کے آگے چلنے لگا۔

”تم نے اس روز مجھے بچایا اس کے لیے شکریہ۔ کیا اب آگے کی بات کریں۔؟“ اس نے بات پلٹ دی۔

”ہاں اس روز تم نے مجھے پھنسانے میں، اور ذلیل کروانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ چار دن بعد شکریہ

بھی یاد آگیا۔ لیکن خیر اب آگے بات کریں۔؟“ وہ بازو سینے پہ باندھے کس قدر تابعداری سے پوچھ رہا تھا

۔ زینیا چند لمحے اسے دیکھتی رہی۔ پھر دھیرے سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تم نے اس روز مجھے کیوں بچایا تھا۔؟“

”میں نے تمہیں نہیں خود کو بچایا تھا۔“ اسکی آواز ہلکی تھی بے حد ہلکی۔

”تم اس روز میرا اینگر سیلف تھیں۔ سولہ سال پہلے اس شہر نے، یہاں کے لوگوں نے میرے ساتھ بہت

برا کیا تھا۔ مجھے لگا تھا میرے لئے کوئی مسیحا آئے گا۔ نہیں آیا۔“ اس نے گردن جھکا دی۔ ماضی ایک

جھماکے سے یاد آنے لگا۔ کچھ بھی کہنا اب تکلیف دے رہا تھا۔ ”میری فیری ٹیل کبھی سچ نہیں ہو سکی

۔ لیکن کچھ انسانوں کی فیری ٹیل سچ ہو جانی چاہیے۔ انکے لئے مسیحا آ جانا چاہئے۔ ورنہ دنیا جذبات سے خالی

ہو جائے گی۔ اور معصوم لوگ میری طرح مانسٹرز بن جائیں گے۔ سولہ سال پہلے قیس کو بچانے کوئی نہیں

آیا لیکن سولہ سال بعد اس نے کسی کو بچا لیا۔“ اس نے گردن اٹھائی۔ اسکی آنکھیں سرخ تھیں۔ رنگت

نچڑ چکی تھی۔ مگر آنکھیں جذبات سے خالی تھیں۔

”تم نے مجھے مانسٹر بننے سے کیوں بچا لیا۔ میری فیری ٹیل سچ کرنے والے تم ہوتے کون ہو۔؟“ جذبات

کا اسکے ساتھ جیسے کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ قیس گردن جھکا کر ہنس پڑا۔

”اس سوال کا جواب فحال میرے پاس نہیں ہے، لیکن کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتیں کہ میں نے یہ سب انسانیت کے تحت کیا۔“

”غور سے میرے ماتھے پہ دیکھو کہیں بے وقوف لکھا نظر آ رہا ہے کیا۔؟“ قیس واقعی آگے کو ہوا، غور سے اسکا بے داغ ماتھا دیکھا۔

”بے وقوف نہیں لیکن ڈھیٹ لکھا ہے صاف صاف، جلی حروف میں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ابھی زینیا کچھ کہتی کہ اسکا موبائل بجنے لگا، اس نے قیس کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ بیگ سے فون نکالتے ہوئے اس نے کال اٹینڈ کر لی۔ قیس اس کے ساتھ کھڑا رہا۔

”آپ کون بات کر رہے ہیں۔؟“

”آپ کو کیا لگا تھا مس زینیا حاکم ہمارے تعلقات اتنے کمزور ہیں کہ آپ ہمارا مال اڑالے جائیں اور ہمیں خبر بھی نہ ہو۔“ آواز تھی کہ صور زینیا نے اپنے قدموں سے جان نکلتی محسوس کی۔ فون پہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑنے لگی۔ ”دو دن کا وقت ہے تمہارے پاس ہمارا مال ہماری بتائی جگہ پہ چھوڑ کر چلی جاؤ، ورنہ ہاسٹل کا کمرہ، تمہارا کراچی سے آیا شوہر، اور تمہاری اکیڈمی ہم سب سے واقف ہیں۔“ وہ اب بھی

کچھ نہ بولی۔ رنگت بری طرح نچڑ چکی تھی۔ قیس نے موبائل اس کے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ زینیا مزاحمت بھی نہ کر سکی۔

”اگر پولیس کو بتانے کی کوشش کی، یا پھر اگر کسی نے تمہاری پشت پناہی کرنے کی کوشش کی، تو تمہارے ساتھ ساتھ اسے بھی مار دیں گے۔“

”اسکی پشت پناہی میں کر رہا ہوں۔ اور مجھے مارنے کے لئے تمہیں خود دس دفع پیدا ہو کر آنا پڑے گا۔“ اس کی آواز سخت تھی۔ سامنے سے شاید کسی کو مرد کے بولنے کی توقع نہیں تھی۔ ”تمہیں صرف اور صرف ہاسٹل، روم نمبر، اور چند غیر ضروری چیزوں کا علم ہے۔ لیکن میں . . . میں تمہاری قبر تک کا حساب تمہارے سامنے لا سکتا ہوں۔“

”ہماری بات اس لڑکی سے ہے بیچ میں بولنے والے تم کون ہو۔“ دوسری طرف سے ایک سخت کھردری آواز آئی۔

”میں تمہارے اور اس کے بیچ میں کھڑا پہاڑ ہوں۔ گراؤ مجھے پھر اس تک آجانا۔ لیکن یاد رکھنا میں وہی ہوں جس کے گھر میں پولیس کو تلاشی کے بعد بھی کچھ نہیں ملا۔ آئندہ اس نمبر پہ کال نہ کرنا آج شام تک میں اس معاملے کے حل نکال لوں گا۔“

”ہمیں حل نہیں بھرپائی چاہیے ہمارا پیسہ۔ وہ بھی اسی لڑکی سے۔“

”آج شام پانچ بجے میرا انتظار کرنا۔“ چبا چبا کر کہتے ہوئے اس نے کال کاٹ دی۔ زینیا بے دھم سی سنگی بیچ پہ بیٹھی تھی۔ فون بند کر کے اس نے زینیا کی طرف دیکھا۔ وہ گردن جھکائے ہوئے تھی۔ اسکے چہرے پہ پریشانی تھی۔ قیس اسکی طرف بڑھا۔

”میں یہ سب کچھ فکس کر لوں گا۔ میرا یقین کرو۔“ قیس نے آج تک کسی کو نہیں کہا تھا کہ اس کا یقین کرو۔

”مجھے یقین سے خوف آتا ہے۔“

”کچھ مسیحا سارے خوف ختم کر دیتے ہیں۔“

”تم مسیحا نہیں، موت کا فرشتہ لگتے ہو۔“

”ہر مسیحا کو موت کا فرشتہ بننا پڑتا ہے۔ جنہیں بچانا ہو ان کے لئے نہیں، جن سے بچانا ہو ان کے لئے۔“

”اصل زندگی میں کوئی مسیحا، کوئی saviour نہیں آتا۔“ زینیا کی آواز شکستہ ہونے لگی۔

”ہمارا اصل زندگی سے کیا تعلق۔ ہم تو جادوئی دنیا پہ یقین رکھتے ہیں۔ وہاں تو مسیحا آجاتے ہیں ناں۔؟“ وہ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یوں کہ دھوپ اسکی پشت سے ہو کر پلٹ رہی تھی۔

”میں تمہاری اصلیت جانتی ہوں اچھا بننے کی کوشش مت کرو۔“ وہ بے زار ہوئی۔

”کسی نے مجھ سے کہا تھا میں اتنا برا نہیں ہوں جتنا بنتا ہوں۔ شاید سچ کہا ہو۔“ زینیا نے بے یقینی سے

گردن اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ یعنی وہ شخص یہ تھا۔؟ مہدی کے ہسپتال میں داخل ہوتے وقت وہ اس آدمی سے بات کرتی رہی تھی۔ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ اس شخص سے کب کہاں کیسے تعلق

نکل رہے تھے۔ کبھی وہ اس کے الفاظوں جیسے الفاظ دہراتی تھی، کبھی وہ سارا زمانہ چھوڑ پناہ لینے اس کے

گھر چلی جاتی تھی۔ اور کبھی اسے دھڑا دھڑ میج بھیجتی تھی۔ اگر یہ اتفاق تھا، تو کچھ زیادہ ہی اتفاق تھا۔ اور اگر یہ سازش تھی تو زینیا اس میں پھنسنا نہیں چاہتی تھی۔

کئی لمحے وہ بس اسے دیکھتی رہی۔ اسی لمحے اس کندھے کے عقب میں اسے آنٹی نظر آئیں۔ وہ اپنی جاگنگ کر چکی تھیں۔ اور اب باقی عورتوں کو الوداع کہہ رہی تھیں۔ زینیا اس سنگی بیچ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ قیس سے بغیر کچھ کہے اس نے اپنے قدم جانے کو موڑے۔ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ زینیا ذرا سے فاصلے پہ جا کر رک گئی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کی سیدھ میں کھڑے تھے۔ دائیں بائیں اونچے درخت، قدموں تلے پتوں سے بھری سڑک۔ اور دور کہیں سے نکلتی سورج کی ذرا ذرا سی روشنی۔ جو قیس کی پشت سے ہو کر پلٹ رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ایک دوسرے پہ جمی تھیں، اور دونوں کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔

”میری فیری ٹیل ہمیشہ ٹریجڈی میں بدل جاتی ہیں۔“ زینیا کی آواز ہلکی تھی۔

”تم نے کہانی کی شہزادی بننے کی خواہش کی ہوگی۔ کچھ کہانیاں ملکہ بد کی بھی ہوتی ہیں۔ جہاں ٹریجڈی کہانی کو ایک نئی زندگی دیتی ہے۔“ وہ رکا، دو قدم آگے بڑھا۔ پتے چرچرائے، دھوپ نے راستہ بدلا۔ ”کچھ مسیحاؤں کی مسیحائی پہ یقین کر لینا چاہیے۔ کیونکہ کبھی کسی دور میں وہ بھی کہانی کا حصہ رہ چکے ہوتے ہیں

“

”ٹھیک ہے۔ پھر آج تاریخ میں پہلی بار ملکہ بد ایک مسیحا کا اعتبار کرتی ہے۔“ وہ کہہ کر چلی گئی۔ اور قیس کئی لمحے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ وہ اسے بچائے گا یہ طے تھا۔

☆☆☆☆☆☆

گوادر آج تیز بارش میں بھیگ رہا تھا۔ تیز ہوا کے تھپڑے، بدن کو راحت بخش رہے تھے۔ کونج حاکم گلابی رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتے میں ملبوس، بڑے بڑے پائنچوں والا ٹراؤزر پہنے دادی کے پلنگ پہ آڑھی ترچھی لیٹی تھی۔ دادی کے ہاتھوں میں کونج کا موبائل تھا، کونج رسالے کے صفحے آگے پیچھے پلٹ رہی تھی۔ ساتھ ساتھ دادی کی گوگل ٹرانسلیٹر بھی تھی۔ دادی کی اردو اچھی نہ تھی، انگلش کے تو پھر کیا ہی کہنے۔ جب وہ ڈرامہ دیکھتی تھیں، کونج انکے پاس بیٹھ کر انہیں ڈرامہ "سمجھاتی" . . تھی۔

”میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں علینا . . . تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن جب تک تم میری ماں کی عزت نہیں کر سکتیں، تب تک ہمارا تعلق آگے نہیں بڑھے گا۔“ ہیرو نے بڑے ہی جوش سے ڈائیلاگ مارا۔

”کہہ رہا ہے تمہیں پسند کرتا ہوں لیکن جب تک تم انسان کی بچی نہیں بنو گی تب تک مجھ سے واسطہ نہ رکھنا۔“ حیران نہ ہوں دیسی ورژن ایسا ہی ہوتا ہے۔

”میں نے ہر بار تمہیں معاف کیا۔ تمہارے منگیتر کے تمہیں چھوڑ دینے پہ بھی برا نہیں منایا، تمہارے ساتھ کھڑا رہا اور تم آج تک نہیں بدلیں۔“ ہیرو کے ڈائیلوگ اب کے انگریزی میں تھے۔ دادی نے رسالا پڑھتی کوچ کو پیر مارا۔ کوچ پہلو بدل کر رہ گئی۔

”کہہ رہا ہے میں نے تمہاری پچھلی عاشقی بھی بھلا دی۔ لیکن تم ہو ہی کتے کی دم۔“ دادی نے سر ہلایا۔ گویا کہہ رہی ہوں ”سہی کہہ رہا ہے۔“ اسی پل کوچ کے موبائل پہ زینیا کی کال آنے لگی۔ دادی اس سے ناراض تھیں سو موبائل کو پلنگ پہ ڈال دیا۔ کوچ نے لپک کر موبائل اٹھایا اور ویڈیو کال کر دی۔ دادی اب پلنگ سے اٹھ کر واشروم کی طرف جا رہی تھیں۔

موبائل کے چوکھٹے پہ اب زینیا کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ کوچ یونہی الٹی لیٹی رہی۔ ”شرم نہیں آتی ناں۔“ بڑی بہن نے دو لفظ کیا کہہ دیئے تم تو منہ پھلا کر ہی بیٹھ گئیں۔“

”میں ناراض نہیں تھی۔ بس تھوڑا مصروف تھی۔ میرے پیپرز ہو رہے ہیں۔“ وہ واقعی ناراض نہیں تھی۔
 -البتہ شرمندہ ضرور تھی۔

”یہ حالت کیا بنا کر رکھی ہے۔ انسان بن کر رہا کرو کوچ۔“ اس نے ناگواری سے اسکی حالت پہ چوٹ کی۔
 -کوئج مسکرا دی۔ ”آج سنڈے ہے زینی۔ سنڈیز آر فن ڈیز۔“

”اسلام آباد میں بھی سنڈے ہی ہے۔ لیکن مجھے دیکھو۔“ وہ کرسی پہ بیٹھی تھی، پیر میز پہ رکھے کرسی پیچھے لے گئی۔ یہاں سے وہ ساری کی ساری نظر آتی تھی۔ وہ آج بھی اچھے سے تیار تھی۔ کوچ کروٹ بدل کر چت لیٹ گئی۔ اور موبائل اونچا کر لیا۔

" . میں اور کتنا بڑھوں تیری جانب . . "

"تو ہے کہ آسمان ہوا جاتا ہے۔..."

زینیا نے سر نفی میں ہلایا۔ جیسے اسکی عقل پہ ماتم کیا ہو۔

"بالاج کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے۔ بات ہوتی ہے ناں۔؟"

"ٹھیک جا رہی ہے۔ اسے چھوڑو نبیلہ باجی کو جو پیسے ادھار دیئے تھے وہ واپس لے لئے۔؟"

”ایک بار مانگے تھے۔ ان کے پاس تھے ہی نہیں دوبارہ مانگ نہیں سکی۔ شرم آتی ہے۔“ اس نے اپنا عذر پیش کیا۔

”تم نے پچھلی بار بھی اپنے پیسے نہیں لئے تھے کوئج ہر دفع ایسا نہیں چلتا۔“

”یاد ماضی شرمناک ہے یا رب۔۔“

”چھین لے مجھ سے حافظہ میرا۔“

اس نے ایک بار پھر لہک لہک کر شعر پڑھا۔ زینیا نے بے زاری سے آنکھیں گھمائیں۔ ”کل تک اگر تم خود اس سے پیسے نہ لے کر آئیں تو وہ خود پیسے دے جائے گی مجھے اس کا فون نمبر معلوم ہے۔۔ یقین رکھنا۔“

کوئج سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنی بہن سے ایک بار پھر مرعوب نظر آتی تھی۔ ”میں بس اس دن کا انتظار کر رہی ہوں جس دن میں تمہارے جیسی بن جاؤں گی۔ تم میری آئیڈیل ہو زینیا۔ جو دل میں وہی زبان پہ۔ ہر لڑکی کو زینیا حاکم ہونا چاہئے۔“ آج سٹائش اور محبت نہیں تھی اس کے لہجے میں۔ آج تھکن تھی۔ جیسے وہ بس تھک ہی گئی تھی۔ تھوڑی دیر مزید بات کرتے رہنے کے بعد اس نے کال کاٹ دی تھی

- دادی اب ایک کونے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ کونج آنکھیں چھت پہ ٹکائے ہوئے تھی۔ جب اسے نبیلہ باجی کا چھوٹا لڑکا بلانے آیا۔ اس کا موڈ نہیں تھا لیکن پھر بھی وہ بستر سے اتری۔ پیروں میں چپل ڈالے اور باہر کی راہ لی۔

نبیلہ باجی کا گھر ان کے گھر سے جڑا تھا۔ بیچ میں بس ایک دروازہ تھا جسے پار کر کے اندر چلے جاؤ۔ یہ دروازہ تب سے تھا جب تک حاکم نواب نے یہ گھر خرید نہ لیا۔ پھر جب اسے ہٹانے کا وقت آیا تو نبیلہ باجی نے رو رو کر ابا سے اجازت لے ہی لی کہ وہ اس دروازے کو نہیں ہٹائیں گے۔ کیونکہ نبیلہ باجی کا ان لوگوں کے سوا ہے ہی کون۔ قصہ مختصر وہ اس دروازے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہر دوسرے تیسرے گھنٹے آدھمکتی تھیں۔

کونج گھر کے اندر آئی تو حسب معمول بچے نیم برہنہ اور میلی کچیلی حالت میں تھے۔ اگر نبیلہ باجی کو کہہ دیتی کہ انہیں صاف ستھرا رکھ لو تو ”بھیا ہم لوگوں کے پاس نئے جوڑے ہوں تو پہنائیں۔ ایک اتارو ایک پہناؤ۔“

وہ برآمدہ پار کرتے سیدھی اندر والے کمرے کی طرف چلی آئی۔ لیکن اندر آکر اس کے جسم سے جان نکل چکی تھی۔ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

”دیکھو آگئی ناں کونج بھی۔ خوا مخواہ تم پریشان ہو رہے تھے۔“ نبیلہ باجی نے پلنگ کی تپائی پہ غیر آرام دہ سے ضیغم سے کہا۔ وہ سخت مضطرب تھا۔ اور کونج تو اب تک اسکی یہاں موجودگی کو بھی پراسیس نہیں کر سکی تھی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کو ٹکڑ ٹکڑ دیکھ رہے تھے۔

”مجھے انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے ملنا چاہتی ہو۔ کیا ایسا ہی ہے۔؟“ وہ مشکوک لگتا تھا۔ کونج کے منہ سے اب تک ایک لفظ نہ نکلا تھا۔ نبیلہ باجی مسکراتے ہوئے باہر نکل گئیں تو ضیغم آگے آیا۔ کونج سہم کر دروازے سے جا لگی۔ مگر وہ پھر بھی آگے آیا اور اسکا بازو پکڑ کر اندر کیا۔ ”یہ کیا طریقہ ہ کونج۔ تم اس طرح پیغام کیسے بھیج سکتی ہو۔ اور وہ بھی اس عورت کے ساتھ۔“

”میں نے کوئی پیغام نہیں بھیجا۔ نہ ہی نبیلہ باجی کے ساتھ نہ کسی اور کے ساتھ۔ تمہیں لگتا ہے میں تمہیں پیغام بھیجوں گی۔“

”تو پھر یہ کیا بکواس ہے۔ میں اپنے دوست کے ساتھ واپس گھر جا رہا تھا۔ اس عورت نے دروازہ کھولا اور مجھ سے میرے دوست کے سامنے کہا کہ میری منگیتر مجھ سے ملنا چاہ رہی ہے۔ اس عورت نے ایک غیر مرد کے سامنے تمہارا نام لیا ہے۔ تمہیں اندازہ ہے میری کتنی سبکی ہوئی ہے۔“ کونج کے اندر نہ جانے اتنی ہمت کہاں سے آئی کہ وہ ضیغم کو یونہی دیکھتے ہوئے باہر گئی اور دروازے سے کان لگائے کھڑی نبیلہ باجی کو بازو سے پکڑ کر اندر لے آئی۔ وہ تو ہیں ہیں کرتی رہ گئیں۔

”یہ کھڑی ہیں تمہارے سامنے۔ پوچھو ان سے کیا میں نے کہا تھا کہ تمہیں بلائیں۔ یا پھر مجھے تم سے ملنا تھا۔؟ خوابوں سے نکل آؤ ضیغم۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔“

ضیغم نے ایک قہر آلود نگاہ نبیلہ باجی پہ ڈالی وہ جو اب بھی اپنی ڈھٹائی پہ جمی تھیں۔ ”ارے ارے میں تو تمہارا بھلا چاہتی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا تم دونوں مجھ پہ ہی چڑھ دوڑو گے۔ اور اگر دوست کے سامنے منگیتر کا نام لے بھی لیا تو ایسا کیا ہو گیا۔“

”ہمارے معاملات سے دور رہیں خاتون۔ آئندہ کونج سے ملنے اور بات کرنے کی ضرورت نہیں آپ کو۔ اور ہمارے بارے میں سوچنے کی تو بالکل ہی کوئی ضرورت نہیں۔“ اس نے چبا چبا کر الفاظ ادا کیے اور

پھر ایک سخت نظر کونج پہ ڈالی۔ وہ اس سے زیادہ سخت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ یونہی اسے دیکھتے ہوئے وہ باہر نکل گئی۔ ضیغم اس کے پیچھے ہی گیا تھا۔ ابھی وہ چھوٹا دروازہ پار کر کے اپنے گھر جاتی جب ضیغم کی آواز، اور اپنے ہاتھ میں پکڑے فون کی گھنٹی پہ رک گئی۔ وہ سنجیدہ چہرہ لئے اس کے سامنے کھڑا تھا۔

”کال آرہی ہے ناں۔؟ یہ میرا نمبر ہے سیو کر لو آئندہ کسی نبیلہ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“ عجیب سے لہجے میں کہتا وہ چلا گیا۔ کونج کی آنکھیں بھر آئیں۔ لوجی کچھ ہوا نہیں اور لڑکیوں کا رونا شروع۔ اب وہ آدھا گھنٹہ پھوٹ پھوٹ کر رونے والی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

شام میں زینیا حاکم کی آنکھ بجتے ہوئے موبائل کی زوں زوں سے کھلی تھی۔ وہ پارک سے واپسی پہ جو سوئی تھی پھر اٹھنے کا نام نہ لیا۔ مندی مندی آنکھوں سے ہاتھ یہاں وہاں مار کر موبائل تلاش کیا۔ جلد ہی اسکی تلاش کامیاب ہوئی۔ نیند سے بھری ہوئی آنکھوں سے نام پڑھا اور موبائل کان سے لگایا۔

”کاش آپ کے تعاقب کار نے آپ کو واقعی مار دیا ہوتا۔“ وہ بڑبڑائی۔

”وہ دوبارہ آگیا ہے زینیا۔ اس نے مجھ پہ حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ کیا تم میری مدد کر سکتی ہو۔“ یہ شوخ مہدی نہیں تھا۔ یہ روبوٹک لہجہ کسی اور کا تھا۔ زینیا آہستگی سے اٹھ بیٹھی۔ موبائل کان اور کندھے کے بیچ میں ٹکایا۔ اور ہاتھ سے بالوں کو پیچھے کرنے لگی۔

”ہر انسان اپنا نجات دہندہ خود ہوتا ہے۔ میں آپ کو نہیں بچا سکتی۔ اور اگر بچا بھی سکتی ہوں تو بچانا نہیں چاہتی۔“ اس بار دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ مہدی کچھ سوچ رہا تھا۔ کچھ وقت بعد ایک غیر انسانی، کھوکھلی آواز زینیا کی سماعتوں سے ٹکرائی۔

”ہر انسان ایک دور میں اپنے ماضی کے گرداب میں پھنسا ہوتا ہے۔ اور اسے نکالنے، سنبھالنے یا پھر بچانے کوئی آتا ہے۔ کوئی معجزہ، وسیلہ، کوئی انسان۔“ وہ ایک پل کو رکا۔ آواز مزید سرد ہوئی۔ ”گوادر کے تاریک پہاڑوں، اور ناامید زندگی سے تمہیں نکال کر اسلام آباد کی آزادی اور روشنیوں میں لانے والا میں تھا۔ اس وقت میرا ماضی میرے حال پہ اندھیرے کی طرح چھا رہا ہے۔ کیا تمہیں نہیں لگتا تمہیں میری مدد کرنی چاہئے۔؟“

زینیا کی جانب سے خاموشی رہی۔ وہ اس مہدی کو پراسیس نہیں کر پا رہی تھی۔ ”اسکارلر شپ جعلی تھی۔ کیا تمہیں واقعی لگا تھا اسلام آباد مسیحائی کی ان حدود کو چھونے لگا ہے کہ ذہانت کی بنا پہ تعلیم بانٹتا پھرے۔“ وہ جیسے اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ زینیا بے تاثر سی بیٹھی رہی۔ اور اسے سنتی رہی۔ ”یاد رکھنا جو اندھیروں سے نکال سکتا ہے۔ وہ واپس اندھیرے کی طرف دھکیل بھی سکتا ہے۔ اور تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہاری آنکھیں روشنی کی عادی ہو چکی ہیں۔“

”آپ مجھے دھمکا رہے ہیں مسٹر کمبیر۔؟“

”نہیں۔ میں تمہیں مستقبل بتا رہا ہوں۔ ممکنات میں سے کچھ نکات۔“ سیگریٹ کا دھواں اس کے چہرے کے اصل نقوش تک رسائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ مہدی نہیں تھا۔ یہ سفاک، غیر انسان کوئی اور تھا۔

”اور اگر میں انکار کر دوں۔ تو کیا کریں گے آپ۔ مجھے دونوں ہاتھوں سے قبر میں دھکیلیں گے۔“ آواز اپنے کمرے میں بیٹھے سیگریٹ کے دھوئیں اڑاتے مہدی تک گئی۔

”میں تمہارے ساتھ ایسا نہیں کر سکتا۔ تمہارے اندھیرے میں نے اپنے ہاتھوں سے ہٹائے ہیں۔ تمہیں چاہیے تم مجھ پہ گو اپ مت کرو۔“ اب کی بار وہ پہلے والا مہدی بن گیا تھا۔ نرم، مخلص۔

”کہاں آنا ہے۔“ زینیا کا اگلا سوال بے حد روبوٹک تھا۔

کچھ وقت بعد . .

یوں تو اسلام آباد میں بے شمار تھیمڈ کیفیز، ریسٹورانز، ہیں لیکن کہانی کا حصہ اس وقت ایک ایسا ریسٹورینٹ ہے جو کہ غار کے طرز پہ بنا ہے۔ انٹیرر پہاڑوں کی سرنگوں جیسا، کرسیاں اور میز قدیم دور کے محل جیسی، اور دیوار پہ لگی مشعلیں خوابناک، سا منظر پیش کرتی تھیں۔ یہاں آکر آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کسی قدیم غار میں قدم رکھ چکے ہیں۔ ناسٹلیجیا کے ماروں کے لئے یہ ریسٹورینٹ ایک تحفہ ہے۔ قدیم دور کے طرز پہ بنی ایک پتھر کی میز کے گرد اسی طرز کی کرسیاں رکھی تھیں۔ غار کے طرز پہ بنی سیلنگ سے جھانکتی زرد روشنی ان کرسیوں کے گرد بیٹھے دو لوگوں پہ پڑ رہی تھی۔ مہدی کبیر جس کا آدھا چہرہ روشنی میں، اور آدھا تاریکی میں۔ زینیا حاکم جس کا سارا چہرہ زرد روشنی پڑنے پہ دمک رہا تھا۔ تاثرات سپاٹ تھے، یوں گویا اس نے کچھ بھی ظاہر نہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہو۔

”انسان اور اسکا ماضی ایک دوسرے سے جڑے رہتے ہیں۔ آپ نے اپنے ماضی میں ایسا کیا کیا تھا جس نے اس تعاقب کار کو آپ کے ساتھ جوڑ دیا۔؟“ کافی دیر بعد وہ بولی تو اس غار میں اسکی آواز دب گئی

-گو نجاتی اگر واقعی غار ہوتی۔ انسان بس "انسپائر" ہو سکتا ہے۔ قدرت کے نظام سا دوسرا نظام بنانا اسکی

اوقات نہیں۔ مہدی نے گردن جھکا دی۔ یوں گویا غار کا سارا بوجھ اس کی گردن پہ در آیا ہو۔

"مجھے معاف کرنا۔ میں کچھ وقت پہلے تک خود غرض ہو گیا تھا۔ تم جا سکتی ہو۔ میں پر اہلم ہوں۔ تمہیں

میرے ساتھ اسے جھیلنے کی ضرورت نہیں ہے۔" زینیا طنزیہ مسکرائی۔

"آپ نے مجھے دھمکی دی ہے۔ اور اس وقت اگر آپ کو لگتا ہے میرے سامنے معصوم بننے سے آپ

میرے ٹرسٹ ایشوز ختم کر سکتے ہیں، یا پھر اوور تھکنگ سے میری جان چھڑوا سکتے ہیں تو آپ غلط

ہیں۔ میں یہاں سے چلی گئی تو، بس یہی سوچتی رہوں گی کہ اب آخر ایسا کیا مقصد تھا جس کے تحت آپ

نے معصوم بننے کا نالک کیا۔" وہ گردن تان کر بیٹھی تھی۔ لیکن جب مہدی نے گردن اٹھا کر اسکی

آنکھوں میں دیکھا، تو آج پہلی دفع سنہری آنکھیں ہرٹ لگیں۔ کچھ تھا ان میں ناقابل اعتبار سا مہدی

کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"تم نے کہا تھا ہر انسان اپنا نجات دہندہ خود ہوتا ہے۔ مجھے لگتا ہے تم نے صحیح کہا تھا۔"

”میں اب بھی اپنی بات پہ قائم ہوں مسٹر کمبیر۔ لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں جن کا intelligence level یہاں (ہاتھ موڑ کر یوں سر کے اوپر تک لائی گویا پیمائش کر رہی ہو) ہوتا ہے۔ ان کے مشورے پہ عمل کرنا آپ کو نجات دلا سکتا ہے۔ شاید میں وہی ہوں۔“ مہدی کی آنکھیں گلابی پڑنے لگی تھیں۔

”میں ماضی کی قید میں ہوں۔ مجھے نجات نہیں مل سکتی۔“

”آپ کی نجات آپ کا سچ ہے۔ کہہ دیں اور بس سچ ہی کہیں۔“ مہدی نے گردن جھکا دی۔ اور میز کی سطح کو ناخن سے کھرچنے لگا۔ وہ خاموش رہا تو زینیا نے اضافہ کیا۔ ”یہ سب کب شروع ہوا تھا۔؟“

”یو نان۔“ آواز ہلکی تھی بے حد ہلکی۔

”دو ماہ پہلے۔؟“ سوال ہوا۔

”دو سال پہلے۔“ اب کے با مشکل زینیا سن سکی۔

”سینٹورینی۔؟“ سوال بدلا۔

”ایتھنز۔“

وہ اپنے آپ سے بولا۔ زینیا کی آنکھوں میں تاسف ابھرا۔ مہدی کمبیر کی زندگی کو اگر دو سال پیچھے لے جاؤ، پھر اسی رفتار سے دو سال آگے لاؤ تو یونان ٹریول کی صرف ایک ہی جھلک دیکھے گی۔ دو ماہ پہلے کی۔ وہ دو سال پہلے بھی یونان جا چکا ہے۔؟ یہ اطلاع نئی تھی۔ اور راز بھی۔ زینیا آگے کو ہوئی۔ آنکھیں چمک اٹھیں۔ غار کی روشنی جیسے ایک طرف ہوئی، اب اسکے چہرے پہ شیطانی کا اندھیرا تھا۔

”کیا ہم یونان کی تاریخ میں جانے کو تیار ہیں۔؟“

”ہمارا پہلا پڑاؤ کوئی اور جگہ ہے۔“ وہ دھیرے سے بولا۔ اور غار نما ریسٹوران سے نکل کر، وقت کے جنگل میں ذرا دیر کو راستہ تلاشتے ہوئے، ماضی کی طرف جانے والا دروازہ کھولو تو تم ایک نئے ملک میں ہو۔ کہانی تمہیں ایک اور سیر کو لے چلی ہے۔ کیا تم تیار ہو۔؟

جکارتہ انڈونیشیا۔

جکارتہ انڈونیشیا کا دارالحکومت ہے۔ اونچی روشن عمارات جو شہر کو زمین میں دھنسائے دیتی ہیں۔ سیاحت کے لئے دلفریب مقامات اور آنکھوں کو خیرہ کر دینے والی روشنیوں کا شہر جکارتہ۔ شہر دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ قدرے پسماندہ ہے یوں جیسے ہمارے کراچی کے پرانے محلے، سٹریٹ فوڈز، اور

مارکیٹس۔ شہر کے اس حصے میں آپ کو ہر سڑک کے اطراف میں ٹھیلہ لگائے کھڑے لوگ ملیں گے۔ جہاں مقامی کھانے بنتے ہیں، لذیذ اور سادہ کھانے۔ جن کے لئے ہمہ وقت لوگوں کا رش لگا رہتا ہے اور رونق رہتی ہے۔ جکارتہ شہر کا یہ حصہ آپ کو کراچی کی یاد دلائے گا۔

دوسرا حصہ ہے "ماڈرن جکارتہ۔" گو کہ دونوں حصے ہی جڑے ہوئے ہیں اور کوئی ظاہری فاصلہ نہیں ہے مگر شہر کا یہ حصہ ایک الگ دنیا ہے۔ رنگوں، روشنیوں، اونچائیوں، رنگینیوں، اور تعاشی کی دنیا۔ یہاں بڑے بڑے مالز، ریسٹورانز، اور کاروباری عمارات ہیں۔ دنیا بھر سے سیاح جب جکارتہ explore کرنے آتے ہیں یہاں کی روشنیاں دیکھ بیٹھیں کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اونچی عمارات کو گردن اٹھا کر دیکھو، شاہانہ مالز میں ٹنگے لباس پہ جی لپچاؤ، چائینز اور امریکن کھانے دیکھ بھوک بڑھاؤ اور کہانی میں آگے سفر کرو تو ایک شناسا سا آدمی جکارتہ کی ایک خوبصورت پل پہ کھڑا نظر آئے گا۔

بھورے سلیکس کے اوپر سفید گول گلے والی شرٹ اور اس کے اوپر ڈینم جیکٹ۔ بالوں کے تازہ اسپانکس، بڑھی ہوئی شیو، گلے میں لٹکتی ایک لمبی چین جس میں ہیمنگ برڈ کا لاکٹ تھا۔ سبز آنکھوں میں ایک الوہی تاثرات تھے۔ ٹریول اسے ایکسائٹ کرتا تھا۔ لوگ اسے فیسینیٹ کرتے تھے۔ یہ پل ایک مصروف

سی شاہراہ کے اوپر بنا تھا۔ بنیادی طور پہ اسے fly over کہنا چاہیے لیکن یہاں گاڑیوں، اور کسی بھی قسم کی سواری کا گزر نہیں ہوتا سو ہم اسے پل کہہ سکتے ہیں۔

آرکیٹیکچر کی اعلیٰ مثال، اور ایک بھول بھلیاں جیسا یہ پل ہر دم زرد روشنی سے دمک رہا ہوتا ہے۔ فرش پہ بھی اسی قسم کی روشنیاں ہیں یوں کہ اگر آپ پیر رکھیں، تو روشنی تیزی سے سفر کرتی آگے سے پیچھے کو جائے گی۔ یہ ایک انتہائی خوبصورت، اور فیسینینٹنگ واک ہے۔

”مہدی کمبیر تم۔؟“ زرد روشنیوں والی پل پہ چلتا مہدی ایک آواز پہ مڑا تھا۔ ”تم نے مجھے بتایا نہیں کہ تم جکارتہ آرہے ہو۔؟“ وہ شخص شکوہ کرتے ہوئے آگے آیا۔ مہدی بھی خوشگوار حیرت سے آگے بڑھا اور اس شخص سے بغلیں ہوا۔

”ضو ریز بن ریان تم یہاں۔؟“ وہ اس پاکستانی نژاد برطانوی شہری سے کہہ رہا تھا۔ وہ جس کا حسن مغربی تھا اور لہجہ مشرقی۔ مہدی کمبیر نے اس کے ساتھ ایک سال تک یورپ ٹور کیا تھا۔ دو سالوں سے وہ دونوں رابطے میں تھے۔ اور اب یوں اچانک یہاں مل رہے تھے۔ دونوں خوش تھے، حیران بھی۔

کچھ دیر بعد وہ دونوں کافی کے کپ لئے پل کی ریلنگ کے پاس کھڑے تھے۔ یہ جگہ کافی اونچائی پہ تھی۔ نیچے دوڑتی گاڑیاں، اور چلتے ہوئے لوگوں کو بخوبی دیکھا جاسکتا تھا اب کے ان کے ساتھ ایک لڑکی بھی تھی۔

”تمہارا اگلا سفر کیا ہے مہدی۔؟“ اب کے ضوریز کے ساتھ کھڑی لڑکی نے پوچھا تھا۔ وہ افریقہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اور سیاہ فام تھی۔ موٹے ہونٹ اور بالوں کی چھوٹی چھوٹی چوٹیاں بنائے کھڑی اس لڑکی کی آنکھیں دنیا کی سب سے خوبصورت آنکھیں تھیں۔ اسے اردو بولنا آتی تھی اور کافی شستہ آتی تھی۔

”میں دو دن بعد ایٹھنز جا رہا ہوں جاشیہ۔ وہاں ایک آرٹ ایگزپیشن ہے۔ اور بہت بڑی تقریب بھی۔ یونان اپنی تاریخ کا ایک حصہ اپنے ساتھی ملک کو تحفے میں دے رہا ہے۔ ہر ملک سے کچھ لوگوں کو بلوایا گیا ہے۔ میں بھی ان لوگوں میں شامل ہوں۔“ لڑکی حیرت سے مسکرائی۔ ضوریز نے مہدی کا کندھا تھپکا۔ وہ اس کے لئے خوش تھا بے حد خوش۔ ضوریز مہدی کے بے لوث دوستوں میں سے تھا۔

”ہم بھی دو دن بعد ایٹھنز جا رہے ہیں۔ مہدی کمبیر سیٹ۔ بیلیٹس باندھ لو۔ تمہیں ایک بار پھر ہمارے ساتھ کا شرف حاصل ہونے والا ہے۔“ جاشیہ مسکرا کر بولی تو مہدی بھی حیرت سے ہنس پڑا۔ البتہ وہ

مغربی آدمی واضح طور پہ غیر آرام دہ ہوا تھا۔ وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنی منگیتر کو وارن کر رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو "یہ آدمی نہیں جاشیہ۔ مہدی کبیر نہیں۔" مضبوط جسامت اور چوڑے کندھوں والی جاشیہ نے اسکی نظروں کی پرواہ کئے بغیر سارا پلان ترتیب دے دیا تھا۔

”ہمارا گروپ بیسٹ تھا میں ہمیں مس کرتا ہوں۔ اور اب ایتھنز کا یہ سفر ہماری زندگی میں بہت کچھ بدلے گا۔“ مہدی کی بات پہ لڑکا بے بس سا مسکرایا، جبکہ لڑکی کی مسکراہٹ پر تپش تھی۔ وہ کچھ طے کر چکی تھی۔ کچھ تھا جو ضروریز کو بے حد غیر آرام دہ کر گیا۔

اگلا سفر کیسا ہونے والا تھا۔؟

(ریستوران کی زرد روشنیوں اور غار جیسی خاموشی میں سنگی کرسی پہ بیٹھا مہدی کبیر کہہ رہا تھا۔ ”کچھ سفر اچھے ہوتے ہیں کچھ برے۔ لیکن کچھ سفر ٹہبڈی ہوتے ہیں۔ ایتھنز میری فینٹسی تھا۔ اور پھر وہ میرے لئے زندگی کی سب سے بڑی ٹہبڈی بن گیا۔“)

ایکروپولس کا چوکور قلعہ ایتھنز کی شان مانا جاتا ہے۔ ایتھنز تاریخ کا امین اور گزر چکی اقوام کی شان و شوکت کا احوال سناتا زندہ و جاوید مجسمہ۔ دن میں یہ قلعہ دیکھنے والوں پہ اگر ہیبت طاری کرتا ہے تو رات

میں اس کی زرد روشنی دیکھنے والوں کو مبہوت کر دیتی ہیں۔ کئی ہزار فٹ کی بلندی پہ پہاڑوں کے سینے پہ کھڑا یہ قلعہ قدیم آرکیٹیکچر کی اعلیٰ مثال ہے۔ گو کہ قلعے کے کئی ستون ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو چکے ہیں ، لیکن یہ قلعہ اب بھی اپنے دیکھنے والوں کو ایک ٹرانس میں دھکیل دیتا ہے۔ قلعے کی روشنیوں میں چہرہ منور کرتے اگر سیاحوں کے ٹولے کی طرف نظر اٹھاؤ تو یہیں ایک بڑے سے پتھر پہ مہدی کسیر بیٹھا نظر آئے گا۔ اطراف میں کئی اور بڑے بڑے مستطیل شکل کے پتھر رکھے تھے۔ ضوریز اس کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اسکے دائیں بائیں گھومتے ہوئے ایک اچھا شاٹ لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کا سہ تھا ۔ زرد بتیاں روشن تھیں۔ اور کئی ملکوں سے آئے مختلف تہذیبوں کے لوگ انہیں اپنے سامنے دیکھنا کیسا انوکھا تجربہ ہو گا ناں۔؟ ”کل تم میوزیم جا رہے ہو ناں۔؟“

ضوریز اب اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ قلعے کا تفصیلی دورہ وہ دونوں کر چکے تھے۔ آس پاس سیاحوں کا رش بڑھ رہا تھا۔ زرد روشنیاں ایک خوابناک سا منظر طاری کئے ہوئے تھیں۔

”کل کے دن کے لئے ویسے میں بہت نروس ہوں۔ ہاں لوگ مجھے فیسینیٹ کرتے ہیں ، بھیڑ مجھے غیر آرام دہ نہیں کرتی لیکن پھر بھی۔“ مہدی کہتے کہتے رکا۔ ضوریز نے ہاتھ میں پکڑا سافٹ ڈرنک کا کین اسکی جانب بڑھایا۔ دو گھونٹ بھر کر گویا گلا تر کیا۔ ”اپنے ملک سے جو دو لوگ آ رہے ہیں میں نے بس

انہیں ٹی وی میں دیکھا ہے۔ مجھے اس لئے بلایا جا رہا ہے کیونکہ دو ماہ قبل لندن کے ایک کیفے میں ، میں نے سپیج دی تھی اور وہ وائرل ہو گئی۔ اب میں بھی مشہور لوگوں میں سے ہوں۔“ وہ گردن جھکا کر مسکرایا۔ ضروریز نے اب کے گود میں رکھے پزا کے ڈبے سے ایک ٹکڑا اٹھا کر اسے تھمایا۔

”تم جب بولتے ہو ناں مہدی دل کرتا ہے اچھائی پہ ایمان لایا جائے۔ ہر نفرت ، انتقام ختم کر کے بس اپنی ذات پہ کام کیا جائے۔ اور دنیا کا سب سے اچھا انسان بن جایا جائے۔“ وہ گردن جھکائے اپنے کین کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ ”لیکن کبھی کبھی بہت دیر ہو چکی ہوتی ہے۔ واپسی ممکن نہیں ہوتی ہے ناں۔“ ”سادگی سے آنکھیں جھپکا کر پوچھا۔ مہدی نے غور سے اسے دیکھا گلے کئی پل وہ اسے کوئی جواب نہ دے سکا۔ پھر جب بولا تو لہجہ سنبھل چکا تھا۔

”دو سال . . . قبل تمہارے دو جڑواں بھائی یونان آئے تھے ناں۔“ ”مہدی کے اس اچانک سوال پہ ضروریز کے چہرے پہ کرب اتر ا۔“ ”کچھ وقت بعد ان دونوں کی لاش ملی تھی۔ کیا میں پوچھ سکتا ہوں کیا ہوا تھا۔؟“ یہ ایک محتاط سوال تھا۔ ضروریز اب کے سیاحوں کو دیکھ رہا تھا۔ قلعے کی روشنی ہر پل بڑھتی جا رہی تھی۔ شان سے کھڑے ستون گویا پیٹھ کا دلا سا تھے۔ یہاں سے نظر آتا ایتھنز اور گھروں کی جلتی بتیوں کو دیکھتے ہوئے اس نے کہنا شروع کیا۔

”ان دونوں پہ الیگل ہونے کا الزام تھا۔ حالانکہ وہ نہیں تھے۔ گریس ان دونوں کا ڈریم ڈسٹینیشن تھا۔ کچھ سفر اچھے ہوتے ہیں، کچھ برے۔ لیکن کچھ سفر ٹریجڈی ہوتے ہیں۔ اور ٹریجڈیز کی ایک ٹریجڈی ہوتی ہے کہ آپ انہیں فینٹسی میں کنورٹ نہیں کر سکتے۔“ اسکی آواز ہلکی تھی، گردن جھکی ہوئی اور آواز گیلی۔

(”کئی بار کچھ چیزیں آپ کی قریب ہوتی ہیں اتنی کہ ہاتھ بڑھا کر چھو سکیں۔ اتنی کی انکی رگ رگ سے واقف ہو جائیں۔ لیکن وقت بتاتا ہے کہ وہی چیزیں آپ سے کتنی دور تھیں۔ اتنی کہ اس کو پانے کی مسافت میں پیر چھالے چھالے ہو جائیں۔ روح نوحہ سنائے۔ اور آنکھ دھوکہ کھا جائے۔ ہمیں لگتا ہے ہم بے وقوف تھے کہ ان رازوں کو نہ پاسکے۔ لیکن۔۔“

”لیکن کیا۔؟“ سنہری آنکھوں نے بے چینی سے سوال کیا۔ سبز آنکھیں خالی خالی تھیں۔

”وقت بتاتا ہے کہ وہ وہ چیزیں، وقت اور راز ایک سراب تھے۔ ایک دھوکہ، illusion اور بس۔ آنکھیں جب تک کھلتی ہیں۔ تب تک فریب کی سیاہ کاری پھیل چکی ہوتی ہے۔“

ایتھنز یونان کا تاریخی ورثہ اپنے بلند و بالا، بلا کی شان و شوکت رکھنے والے میوزیم میں چھپائے بیٹھا ہے۔ دنیا بھر سے سیاح جب ان میوزیمز کا رخ کرتے ہیں۔ تب ایتھنز کے یہ عجائب گھر اپنا سینہ کھول دیتے ہیں۔ اور تاریخ میں ہو چکی کئی سازشیں، قربانیوں، اور ثقافت کا راز کہہ سناتے ہیں۔ ایسے ہی ایک میوزیم میں اس وقت دنیا بھر سے آئے معتبر افراد جمع تھے۔ یونانی، یہودی، ہندوستانی، پاکستانی، امریکی اور کئی اور اقوام کے لوگ۔

ایکروپولس میوزیم کی عمارت اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ اندر آؤ تو سفید رنگ ہر جگہ چھایا ہوا ہے۔ سنگ مرمر کے چھوٹے، بڑے ستونوں پہ مختلف عجائب ترتیب سے رکھے گئے تھے۔ شیشے کی بڑی بڑی کھڑکیوں سے شہر کی روشنیاں نظر آتی تھیں۔

”ان گوروں کو یہ ہلکی بات، مدہم میوزک اور جنازے جیسی تقریبات میں کیا انٹرسٹ ہے۔؟“ بیگی شرٹ اور کارگو پینٹ والا ضروریز بے زاری سے میوزیم میں یہاں سے وہاں نظر گھما رہا تھا۔ بڑھی ہوئی شیو، اور اچھے سے تیار ہو کر آیا وہ وجیہہ لگ رہا تھا۔ وہ مہدی کے مہمان ہونے کے ناطے یہاں آیا تھا۔ ورنہ آج کسی بھی فرد کا داخلہ ممنوع تھا۔

”تم ان گوروں کو چھوڑ کر اس میوزیم کو دیکھو۔ تاریخ کا یہ ورثہ دیکھو اور آرکیٹیکچر دیکھو۔“ مہدی غور سے گردن اٹھائے فیسینیٹ سا میوزیم کی ایک ایک چیز دیکھ رہا تھا۔

”اتنا برا وقت نہیں آیا کہ یونانیوں کی گلی سڑی ہڈیاں دیکھوں۔ یہ شوق تمہیں مبارک۔“ وہ نخرے باز آدمی بے زاری سے کہتا آگے بڑھ گیا۔ اس کی اردو میں برطانوی جھلک تھی۔

یہ میوزیم ایک اونچے قلعے کی مانند تھا۔ مگر ایک جدید ٹچ لئے ہوئے۔ یوں لگتا تھا جیسے آثار قدیمہ کے اوپر ہی ایک عمارت کھڑی کر دی گئی ہو۔ کئی جگہوں پہ شیشے کی دیوار نما جگہ تھی۔ جہاں سے نیچے جھانکو تو قدیم یونانی قلعوں کے ڈیزائن، مختلف تاریخی ورثے اور قدیم دور کے جنگ کے میدان کو اس خوبصورتی سے اس ذرا سی جگہ پہ فٹ کیا گیا تھا کہ دیکھنے والے مسمرائز ہو جائیں۔۔۔ ستون اور فرش بالکل سفید تھا۔ کورا سفید۔ قدم دھرتے ہوئے ڈر لگتا تھا کہ کہیں میلانہ پڑ جائے۔ باہر سے چھن کر آتی دھوپ ستون کے سائے کو لمبا کر رہی تھی۔ مہدی اس وقت شیشے کی ریلنگ پہ ہاتھ جمائے نیچے دیکھ رہا تھا۔ ایک جنگی میدان کی شبیہ، گھوڑے، فوج، ہتھیار، سپاہی۔ یوں اونچائی پہ کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے والے کو واقعی یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنے سے ذرا فاصلے پہ جنگ ہوتے دیکھ رہا ہو۔ اس کے عقب میں کسی نے اس کے کندھے پہ دستک دی تو وہ ٹرانس سے باہر آیا۔

”یہ سب کتنا خوبصورت ہے ناں۔؟“ سبز آنکھیں اب بھی مڑ مڑ کر اس منظر کو دیکھ رہی تھیں۔ ”یہ سب کتنا حقیقی ہے ناں۔ جی چاہتا ہے آگے بڑھ کا چھو لوں۔“

”تم اسے آگے بڑھ کر چھو گے اور یہ تحلیل ہو جائے گا اگر نہ ہوا تو غیر حقیقی ہو جائے گا بلکل ایک سراب کی مانند۔ ایک illusion جیسے۔“

”ہر وقت ایک ڈارک سائیکالوجی ساتھ رکھتے ہو۔ تھک نہیں جاتے۔؟“ ضروریز مسکرایا۔ مگر اسکی آنکھیں نہ مسکرا سکیں۔

”میرے بھائیوں کو قتل کیا گیا تھا مہدی۔ ان دونوں نے دو پولیس والوں کو ایک لڑکی کے ساتھ زیادتی کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ وہ عینی شاہد تھے۔ اپنی ٹرویل میٹ کے ریپ کے شاہد۔ انہیں الیگل قرار دے کر جیل لے جایا گیا۔ ہماری حکومت نے انکی دادرسی نہیں کی۔ صرف اس لئے کیونکہ ہم ہیکرز تھے۔“ مہدی بھونچکا سا رہ گیا۔ اس وقت ضروریز بول رہا تھا اور مہدی ساکن تھا۔ ”ہاں ہم ہیکرز تھے۔ ہم کئی ملکوں کا کانفیڈینشل ڈیٹا چوری کر کے دوسرے ملک کو بیچتے تھے۔ لیکن ہم نے کبھی اپنے ملک سے غداری نہیں کی تھی۔ ہم نے کسی کو مارا نہیں تھا۔ پھر ہمیں کیوں مارا گیا۔؟ صرف اس لئے کیونکہ ہمارا تعلق اس ملک سے

تھا، جہاں دہشت گردی عام تھی۔ لیکن کیا ہم وکٹمز نہیں تھے۔؟ دہشت گردی بھی ہمارے ملک میں ہو۔ اور ذلت بھی ہم اٹھائیں۔؟“ وہ رک گیا۔ کہتے کہتے تھم گیا۔

”سب کہتے ہیں کہ ان دونوں نے جیل سے بھاگنے اور پولیس والے کو مارنے کی کوشش کی تھی۔“ ہنس جیسے سفید میوزیم میں کھڑے مہدی نے چند الفاظ کہے۔

”وقت بتاتا ہے کہ وہ وہ چیزیں، وقت اور راز ایک سراب تھے۔ ایک دھوکہ، dillusion اور بس۔ آنکھیں جب تک کھلتی ہیں۔ تب تک فریب کی سیاہ کاری پھیل چکی ہوتی ہے۔“ ضروریز تلخی سے بولا تھا۔

”کچھ کہانیاں ہیروز کی ہوتی ہیں۔ کچھ ولن کی، اور کچھ ملکہ بد کی۔ لیکن صدیوں میں کوئی ایک کہانی ہوتی ہے جہاں ہیرو، ولن، اور وکٹم ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ صدیاں بیت چکیں اور اب وکٹم کی کہانی شروع۔ وکٹمز کی ایک خاصیت ہوتی ہے۔ وہ کہانی کے ہر پہلو سے واقف ہوتے ہیں اور پھر کاساپلٹ دیتے ہیں۔“

۔

کئی سارے اعلیٰ افسران کی معیت میں وہ خاص تاریخی ورثہ بلاخر دنیا کے سامنے لایا جا رہا تھا۔ پہیوں والے ماربل کے ٹکڑے پہ رکھا چوکور شیشہ اور اس شیشے کے اندر رکھا وہ ورثہ۔ سیاہ کپڑے سے شیشے کو ڈھک دیا گیا تھا۔ اونچے ستون اور ماربل پہ رکھے عجائب راز داری سے گردن موڑے اس ورثے کو دیکھنا چاہتے تھے۔ اور عین اسی لمحے ایک اعلیٰ شخصیت نے کپڑا اٹھایا۔

”جانتے ہو مہدی ایک کامیاب Heist کیسی ہوتی ہے۔ اور کسی بھی ہیسٹ کے لئے سب سے ضروری چیز کیا ہے۔؟“ میوزیم کے سفید احاطے میں کھڑا ضوریز نظریں دور تقریب پہ جمائے کہہ رہا تھا۔ اسکی بھوری بڑھی ہوئی شیو دھوپ پڑنے پہ چمک رہی تھی۔ کانچ جیسی نیلی آنکھوں میں تپش تھی۔

اندر ایک سنہری بروج تھا۔ جس کے اوپر سرخ اور نیلے ہیرے لگے تھے۔ اور ان ہیروں کے اطراف میں عبارت کنندہ تھی۔ دیکھنے والے اسے دیکھتے رہ گئے تھے۔ یہ ایک قدیم تاریخی ورثہ تھا۔ جسے یونان اپنے ایک دوست ملک کے اعلیٰ حکام کو تحفہ دے رہا تھا۔ لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔ بروج کو باہر نکالا گیا۔ ہاتھ میں لے کر اسے بلند کیا گیا۔ اس سفید میوزیم کا سب سے رنگین ٹکڑا۔

”ایک کامیاب پیسٹ کے لئے ٹیم ورک کی ضرورت ہوتی ہے۔ پلان کی اور ہر پلان کے تین بیک اپ پلانز کی بھی۔ لوگ کہتے ہیں فلاں ملک میں کرائم نہیں، فلاں جگہ قتل، ڈاکہ ممکن نہیں۔ جھوٹ کہتے ہیں۔ کرائم ہر جگہ ہر ملک میں ہوتا ہے۔ بس آپ کے پاس ایک پلان ہونا چاہیے۔ ہر جھول سے پاک آزاد پلان۔“

بروج نکالا گیا۔ اور اب یونان کا ایک اعلیٰ عہدہ دار اپنے دوست ملک کے ساتھی کے کوٹ کی جیب پہ وہی بروج لگا رہا تھا۔ دفعتاً وہ شخص ٹھہرا۔ اپنے کوٹ پہ ہاتھ چلاتے آدمی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور یونہی کھڑے کھڑے اس کا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ اسکی آنکھیں تفشیش سے سکڑیں تھیں۔ اور پھر یکدم اسکی آنکھوں میں ناگواری اتر آئی۔ وہ آرٹ کلیکٹر تھا۔ انکی آنکھیں ایکسرے ہوتی ہیں۔

(”اور سب سے اہم اور رسکی چیز ہوتی ہے چوری کی جگہ سے کسی کو اپنے ساتھ ملا لینا۔ جس دن کسی ملک، جگہ، علاقے سے ایک غدار آپ کے ساتھ مل جائے۔ اس دن وزیر اعظم ہاؤس میں بھی پیسٹ ممکن ہے۔ اور وائٹ ہاؤس میں بھی۔“ مہدی نے سنہرے بروج سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا۔

”چوری کیا ہوتی ہے۔؟“

ضوریز مسکرایا۔ اور مہدی کے کان کے پاس جھکا۔ ”چوری سراب ہوتی ہے۔ ایک برم۔ کسی کو

illusion دکھاؤ اور پھر متاع حیات لوٹ لو۔“

”یہ نقلی ہے۔۔“ الفاظ ہتھوڑے کی مانند وہاں کھڑے تمام افراد کے سر پہ لگے تھے۔ مختلف ممالک سے

آئے اعلیٰ افسران، اونچے عہدے کے لوگ ہر کوئی دم سادھ گیا۔ مہمان آدمی نے میزبان کو ایک حقارت زدہ نظر سے دیکھا اور باہر نکلتا چلا گیا۔ ضروریز نے پاس ہی کسی ایک اعلیٰ یونانی افسر کو تھمزاپ کا اشارہ کیا تھا۔ اس وقت، اس پل یونانی حکومت اور دفاعیہ اداروں کے سر پہ گویا ساری دنیا کے پہاڑ گر پڑے ہوں۔ ایتھنز شل رہ گا۔ ساکت، بے سانس، خالی۔

(غار نما ریستوران کی زرد بتیاں ایک پل کو ساکت ہو گئی تھیں۔ آس پاس کانٹے چھج کی آواز کانوں میں صور کی طرح چھ رہی تھی۔ مہدی کی آنکھیں بے طرح سرخ ہو چکی تھیں۔ گلابی پن بڑھ گیا تھا۔ زینیا آگے کو ہوئی۔ ”اس کے بعد کیا ہوا تھا مسٹر کمبیر۔؟“ مہدی نے گردن جھکا دی۔

”ٹریول میرا شوق نہیں اسکیپ ہے۔ میں نے آدھی زندگی اندھیروں میں گزار دی۔ اب بھی ایک حصہ اندھیرے میں ہے۔ ٹریول نے مجھے روشنی دی۔ سکون دیا۔ ٹریول نے مجھے نام دیا۔ میرے الفاظ لوگوں تک

پہنچائے۔ میں واپس اندھیرے میں نہیں جانا چاہتا تھا۔“ اس کی آنکھ کے کونے سے ایک آنسو ٹوٹ کر گرا۔
 ”میں اپنے نام کے ساتھ ایک داغ نہیں چاہتا تھا۔“

بادلوں کی اونچائیوں کو چھوتی ایتھنز کے ایک ہوٹل کی یہ عمارت اس وقت اضطراب میں مبتلا تھی۔ پولیس کی ایک بھاری نفری ہر سویت، کمرے اور اور لابی کو چھان رہے تھے۔ اپنے سویت کی بالکنی میں کھڑا مہدی گلاس وال سے باہر پولیس کو اپنا کام کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اسکی آنکھوں میں بے چینی تھی۔ چہرہ سفید پڑ رہا تھا۔ کچھ تھا جس کا الہام اسے ہو چکا تھا۔ سارا ایتھنز الٹ پلٹ کر دیا گیا تھا۔ یہ کوئی معمولی آرٹ ہیسٹ نہیں تھی۔ یونان کو اپنے مہمان اور دوست ملک کے آگے سبکی اٹھانی پڑی تھی۔ تقریب میں موجود ایک ایک شخص کا ڈیٹا، کھانا پینا یہاں تک کہ اسکے پیدا ہونے کی جگہ تک معلوم کروالی گئی تھی۔ کچھ ہو تو ملے ناں۔

”کہہ دو کہ یہ تم نے نہیں کیا۔ کہہ دو کہ میں زیادہ سوچ رہا ہوں۔“ بیڈ کی پانٹی پہ بیٹھا مہدی گویا خود سے کہہ رہا ہو۔ ضرور نے بے یقینی سے سینے پہ ہاتھ رکھا۔

”یعنی تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ یہ چوری میں نے کی ہے۔ اوہ کم آن مہدی۔ کل اگر میں تم سے قتل کا طریقہ ڈسکس کروں گا تو کیا میں قاتل ہو جاؤں گا۔“ وہ بے زاری سے کہہ رہا تھا۔ دور کہیں مہدی جانتا تھا وہ جھوٹ کہہ رہا ہے۔ پولیس اسے صرف اس بنا پہ نہیں پکڑ سکتی تھی کہ ماضی میں اس کے بھائیوں کا ریکارڈ برا رہا ہے۔ مہدی سر پکڑے بیٹھا رہ گیا۔ اندھیرا ہر سو پھیل رہا تھا۔ لیکن مہدی کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔

”کئی بار آپ ولن یا ہیرو نہیں ہوتے۔ بعض دفع آپ وکٹمز ہوتے ہیں۔ اور وکٹمز کہانی کا بہترین رخ دیکھ سکتے ہیں۔ میں بھی کہانی کا وہ رخ دیکھ چکا تھا۔ میں وکٹم تھا۔ ولن نہیں۔ . . . گھڑی رات کے بارہ بج رہی تھی جب مہدی کا موبائل زور زور سے تھر تھرایا۔ چوتھی منزل پہ واقع مہدی کے سویٹ میں بتیاں بجھی ہوئی تھیں۔ وہ بالکنی میں رکھے صوفے پہ سو رہا تھا۔ ایک ہاتھ نیچے لٹک رہا تھا اور آنکھیں بند تھیں۔ موبائل کی آواز پہ اس کی نیند میں خلل پڑا۔ وہ مندی مندی آنکھوں سے فون کان سے لگا گیا۔ آواز خمار میں ڈوبی تھی۔ لیکن اگلے ہی پل اسکی نیند بھک سے اڑی تھی۔ بالکنی سے نظر آتی ایتھنز کی روشنی یکدم اسکی آنکھوں میں چھنے لگی۔ وہ فون کان سے لگائے دیوانہ وار اندر کی جانب بھاگا۔ ضروریز وہاں

نہیں تھا۔ مہدی اسے نیم اندھیرے سویٹ میں شل سا کھڑا رہ گیا۔ وہ کہانی کا وکٹم تھا۔ اسے استعمال کیا جا چکا تھا اور اب اس کے پاس کوئی جائے فرار نہیں تھی۔ تمام راہیں آج مہدی کبیر پہ مسدود ہوئیں۔

لیپ کی زرد روشنی میں اسے ایک اسکی نوٹ نظر آیا۔ شل ہوتے قدموں سے مہدی نے وہ نوٹ اٹھایا۔

”تمہیں جب کبھی میری ضرورت پڑے میں تم سے ایک فون کال کی دوری پہ ہوں۔ میرے الفاظ جھوٹ تھے، جذبات اور دوستی نہیں۔“ مہدی دھیرے دھیرے فرش پہ بیٹھتا چلا گیا۔ اسے دنیا اپنے سر پہ گھومتی محسوس ہوئی۔

(”میں جب کسی ملک جاتا ہوں تو میرے اندر تازگی بھر جاتی ہے۔ ایک شہر، گھر، ملک مجھے گھٹن میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اس دن اگر میں وہ سب نہ کرتا تو مجھے ڈی پورٹ کیا جاتا۔ ساری دنیا جان جاتی کہ ایک شخص جسے مہدی کبیر کے مہمان خصوصی کے طور پہ تقریب کا حصہ بنایا گیا وہ آرٹ تھیف تھا۔ دوست کی اچھائیوں کا کریڈٹ آپ کو ملے یا نہ لیکن اس کے گناہوں میں آپ کا حصہ ضرور ہوتا ہے۔ میں اپنے شاندار کیریئر پہ ایک دھبہ نہیں چاہتا تھا۔ یہ مجھ سے نہیں ہوا۔“)

لابی میں کھڑا نیلی آنکھوں والا افسر تیز تیز انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ مہدی شل ہوتے جسم اور جھکتی ہوئی گردن کے ساتھ اس کے سامنے کھڑا تھا۔ پاکستان سے آئے ایک اعلیٰ افسر بھی یہیں موجود تھے۔

”وہ آدمی تمہاری ذمہ داری تھا مہدی۔ اسے تم لائے تھے۔ اب وہ یہاں نہیں ہے۔ سی سی ٹی وی میں اس نے اپنا سراغ چھوڑا ہے۔ یعنی وہ بتانا چاہتا تھا کہ اس نے ہمیں گرایا ہے۔“ پولیس افسر ترش لہجے میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھے وہ آدمی لا کر دو مہدی کمبیر۔ ورنہ ڈی پورٹ اور ڈیفیم ہونے کے لئے تیار رہو۔“ وہ کوئی معمولی سپاہی نہیں تھا وہ اعلیٰ عہدہ دار تھا۔ زبان اسکی تھی الفاظ اسکی حکومت کے تھے۔

کچھ دیر بعد پول سائیڈ پہ بیٹھا مہدی فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔ اس کے پاس ایک نمبر تھا جو ضرور نے اس کے لئے چھوڑا تھا۔ پانی کا جھلملاتا عکس اس کے چہرے پہ پڑ رہا تھا۔ اگر نظر گھما کر دیکھو تو آس پاس کئی اور لوگ تھے۔ ایک سیٹ اپ لگا کر بیٹھے چند ہیکرز۔ پولیس، اور کئی اعلیٰ عہدہ دار۔ گھنٹی جا رہی تھی۔ اور کال اٹینڈ ہو گئی۔ دونوں کئی پل خاموش رہے۔

”تم نے کہا تھا اگر کبھی مجھے ضرورت ہو تو تم بس ایک کال کی دوری پہ ہو۔ کیا اسے سچ مان لوں۔ یا پھر یہ بھی فریب ہے۔؟“ اس کے لہجے میں تلخی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ وہ بس پوچھ رہا تھا۔ دوسری جانب

خاموشی رہی۔ ”تم نے کہا تھا مجھے سن کر لگتا ہے کہ اچھائی پہ یقین کیا جائے۔ کیا تم ایک بار میری ان باتوں کو سننے آ سکتے ہو۔ شاید میرے الفاظ کچھ بدل سکیں۔“ ضروریز نے گلا تر کیا اور کچھ کہنے کو لب کھولے۔ وہ شرمندہ تھا۔ مہدی کو استعمال کیا جانا غلط تھا۔

”میں اپنے بھائیوں کی موت نہیں بھولا تھا مہدی۔ مجھے انتقام چاہیے تھا۔ اور صرف میں نہیں میری پوری ٹیم جن میں دس لوگ شامل تھے۔ ہم سب کے ساتھ کچھ نہ کچھ ہو چکا تھا۔ میرے بھائی اکیلے نہیں تھے۔ اس روز اس پولیس سٹیشن میں دس لوگ مارے گئے تھے۔ جن کی لاشیں بھی نہیں ملیں۔ دس مختلف ملکوں کے دس لوگ۔“

”تم اس وقت کہاں ہو۔؟“ مہدی نے سوال بدلا

”پلاک (ہیتھنز کا ایک چھوٹا سا خوبصورت ٹاؤن) میں۔ ہاں جانتا ہوں کسی نے مجھے وہاں نہیں ڈھونڈا

ہوگا۔ بلکہ ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے میں ٹریول کر رہا ہوں چھپ نہیں رہا۔“

”کل صبح پلاک میں۔“ مہدی نے ایک سطر کہہ کر کال کاٹ دی تھی۔ اس کا چہرہ غیر انسانی تھا۔ آنکھیں

خالی خالی۔

”مجھے لگا تھا الفاظ کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ جھوٹ لگا تھا۔ مجھے لگا تھا لوگوں کے ساتھ معصوم رہو تو لوگ آپ کے ساتھ معصوم رہتے ہیں لیکن میں غلط تھا۔ کئی بار آپ کی زندگی ایک unexpected ٹرن لے لیتی ہے۔ اور پھر آپ کے پاس ایک ایسا ماضی آجاتا ہے جو ہمیشہ آپ کے ساتھ رہتا ہے۔ کبھی نہ جھوٹ نے کے لئے۔“

ایتھنز کے دامن میں واقع پلاکا ایک فیری ٹیلیس گاؤں ہے۔ جہاں کیفے، مارکیٹس، شاپس اور کئی چھوٹے اور خوبصورت ریستوران ہیں۔ کیفیز اور شاپس کے باہر قطار در قطار سرخ، نیلی کرسیاں اور چھوٹی چھوٹی میز سجی ہوئی ہیں۔

کئی پکچر اسپاٹ ایسے ہیں جہاں لوگ دھڑا دھڑا تصویر اتار رہے ہوتے ہیں۔ ہمہ وقت راہ گیر اور سیاحوں کا رش اس پر سکون گاؤں کو رونق بخش رہا ہوتا ہے۔ لمبی اور پتلی سفید گلیاں جن کے فرش پہ بھی سفید چونا پھیر دیا گیا ہے، اور گھروں کے دروازے مختلف رنگوں کے ہیں۔ پلاکا بلاکا دل فریب ہے۔ سفید گلیاں اگر خوش آمدید کہتی تھیں تو باہر رکھے گملے سیاحوں کو دیکھ کر مسکراتے تھے۔ ایسی ہی ایک گلی میں کیفے کے باہر رکھے سرخ اسٹول پہ دو لوگ بیٹھے تھے۔ انکے ہاتھوں میں سرخ نقش و نگار والے کپ تھے۔ جن میں

بلیک کافی تھی۔ رش آج قدرے کم تھا۔ یا شاید پولیس جگہ کو خالی کروا چکی تھی۔ مغربی نقوش والا مرد اپنے سامنے بیٹھے مہدی کو تک رہا تھا۔

”میں جانتا ہوں تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوا بہت برا ہوا۔ دو سال قبل اس ٹریول گروپ نے جو ٹریجڈی دیکھی اس میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔“ سفید گول گلے والی شرٹ کے اوپر سفید ہی جیکٹ پہنے بیٹھا مہدی کہہ رہا تھا۔ ”ہر قوم میں کچھ اچھے لوگ ہوتے ہیں اور کچھ برے۔ اچھوں کو وہ سزا نہیں دی جاتی جو بروں کے لئے ہو۔ واپسی ممکن ہے لوٹ آؤ پلیز۔“ وہ اس وقت مخلص تھا۔ انکی دوستی تین سال پرانی تھی۔ وہ واقعی فکر مند تھا۔ ضرور مسکرایا۔ وہ مسکراتا تھا تو گال میں گڑھا بنتا تھا۔ وہ ایسا تھا جس پہ ڈھیروں ڈھیر کہانیاں لکھی جائیں۔

”یہ پلان، یہ انتقام آج کا نہیں ہے۔ تین سال پرانا ہے۔ دس لوگ، دس دماغ، دس مختلف ممالک سے آئے لوگوں کا انتقام جنہوں نے اپنے گھر والوں کو کھویا۔“ وہ رکا ایک پل کو مہدی کی آنکھوں میں دیکھا۔ ”کل رات میری ساری ٹیم یہاں سے جا چکی ہے۔ میں رک گیا۔ میں رک گیا مہدی تمہارے لئے۔“ مہدی کی آنکھوں میں شاکي سا تاثر ابھرا۔ ضرور کہتا رہا۔ ”ہاں ہم نے تمہیں استعمال کیا غلط کیا۔ لیکن جو کچھ میں نے اپنے انتقام کے لئے کیا وہ صحیح تھا۔ دس دفع دوبارہ موقع ملا دوبارہ کروں گا۔ لیکن تم

مہدی تم میرے لئے اہم ہو۔ میرے دوست ہو تم۔ سب نے کہا تم کو لیٹرول ڈمیج ہو۔ لیکن سب کو کیا پتہ تم میرے دوست ہو۔ میں برا ہو سکتا ہوں۔ میری دوستی نہیں۔“

مہدی کو لگا وہ سانس نہیں لے سکے گا۔ آس پاس چلتے پھرتے عام لباس والے پولیس اہلکاروں سے اسے خوف آیا۔ کاش وہ انہیں واپس بھیج سکتا۔ ”میں بھاگ سکتا تھا۔ بلکہ میں بھاگ سکتا ہوں۔ لیکن میں نہیں جاؤں گا۔ کیونکہ میں نے غلط آدمی چنا۔ تم، تمہاری ریپوٹیشن، تمہاری جان کسی کو کچھ نہیں ہوگا۔ میں برا ہوں۔ لیکن شاید تم بھول رہے ہو۔“

"Evil isn't born it's made"

مہدی اسے دیکھے گیا۔ اسکی آنکھوں کا کرب اس کے الفاظ کی سچائی۔ وہ کچھ بھی پراسیس نہ کر سکا۔ وہ وکٹم تھا؟ ولن یا پھر ہیرو۔؟

”تمہیں میری وجہ سے مصیبت میں پڑنے نہیں دوں گا۔“

"For you a thousand times over"

اس نے کہتے ساتھ جیکٹ کی جیب سے کچھ نکالا۔ مہدی بے اختیار اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب کے اسے واقعی سانس نہیں آ رہا تھا۔ سنہرا بروج اس کے سامنے تھا۔

”میں تمہیں بچا لوں گا۔ تم بھاگ جاؤ۔۔۔ ضروریز بھاگو۔۔۔ یہاں سے۔ خدا کے لئے جاؤ۔۔۔ میری فکر مت کرو جاؤ۔۔۔“ وہ اسکی منت کرنے لگا تھا۔ وہ اردو میں بات کر رہے تھے مگر پولیس والوں کے کان میں ٹرانسلیٹر آلہ لگا تھا۔ اسی وقت اس نے جھک کر اسکا ہاتھ پکڑا، ایک نظر آس پاس کھڑے عام کپڑوں والے افسران کو دیکھا اور، اور پھر اندھا دھند گلیوں میں بھاگنے لگا۔ ضروریز بے اختیار ہنستے ہوئے اس کے ساتھ بھاگ رہا تھا۔ پلا کہ حیرت زدہ تھا۔ سفید جیکٹ والا مہدی مضطرب تھا۔ یوں گویا ساری دنیا کا غم اسے ہو۔ اس کے ساتھ بھاگتا مرد دیوانہ وار ہنس رہا تھا۔ گویا ساری دنیا کی بے فکری اسے ہو۔

ہالچل سی مچ گئی تھی۔ پولیس انکے پیچھے تھی۔ انکو لگتا تھا شاید یہ ضروریز کا کام ہے۔ وہ خود کو بچانا چاہ رہا ہے۔ بروج اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ گلیوں میں بھاگ رہے تھے۔

”یہ لوگ مجھے مارنے آئے ہیں مہدی مار کر ہی جائیں گے۔ بلا وجہ کی کوشش مت کرو۔“ پھولتے ہوئے سانس کے ساتھ وہ با مشکل بول سکا۔ پھر ایک جھٹکے سے مہدی کا ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔ لمبی پتلی گلی میں وہ دونوں رک گئے۔ دونوں جانب پولیس کے اہلکار تھے۔ سفید گلی میں کھڑے وہ دونوں شخص اسی گلی کا حصہ لگے۔

"For you a thousand times over"

نم آنکھوں سے مسکرا کر سبز آنکھوں کو جتایا۔ پھر اپنے اطراف میں پھیلی نفری کو دیکھا اور ہاتھ میں پکڑے بروج کو۔ مہدی کی آنکھیں منت کر رہی تھیں وہ باقاعدہ ہاتھ جوڑے گزنیچے کرنے کو کہہ رہا تھا۔ پولیس والے ایک کمرنل سے negotiate نہیں کرنا چاہتے تھے۔ انکی بندوقیں نشانے پہ تھیں۔ انکے ہاتھ بڑھے ہوئے۔ یوں جیسے انکا ورثہ دے دو اور جان بچا لو۔ مہدی گھٹنوں کے بل بیٹھا ان کے آگے ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ ضروریز مسکرایا ٹھنڈی سفاک مسکراہٹ اور اس نے ہاتھ میں پکڑے بروج کو دو ٹکڑے کے کر پھینک دیا۔ پھر جیسے ہر چیز رک گئی۔ سب کچھ سلو موشن میں ہونے لگا۔

پولیس کی گنز لوہا نکال رہی تھیں اور وہ لوہا ضرور کے سینے میں اتر رہا تھا۔ مہدی نے اسے پورے قد کے ساتھ گرتے دیکھا۔ سفید دیواریں خون کے چھینٹوں سے بھر گئیں۔ گلی کا پکی اینٹوں والا فرش سرخ سیال سے بھرتا چلا گیا۔ مہدی اس منظر کو نہیں بھول سکتا تھا۔ کم از کم اس زندگی میں نہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کے قدموں سے جان نکل چکی تھی۔ وہ خود کو زمین پہ گھسیٹتے ہوئے اس کے قریب آیا۔ دل پہ ہاتھ رکھا۔ ہاتھ سرخ ہو گیا۔ دھڑکن ساکن، خاموش، نل ایک انسان اسکی وجہ سے قتل ہو چکا تھا اور یہ گلٹ ساری عمر اس کے ساتھ رہنے والا تھا۔ پلاکہ کی خوبصورت گلیاں اس کے لئے وحشت بن گئیں۔

غار کے طرز پہ بنے ریستوران میں واپس آؤ تو مہدی کا چہرہ سفید تھا یوں گویا کسی نے سفید چونا پھیر دیا ہو۔

”مجھے پراسیس کرنے کے لئے وقت چاہیے۔“ زینیا بے تاثر لہجے میں کہتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”مجھے معاف کر دینا میں نے تمہیں استعمال کیا۔“ اسکی آواز کھوکھلی تھی۔

”آپ کسی کو استعمال نہیں کر سکتے۔ کم از کم مجھے تو بلکل نہیں۔“ وہ کہہ کر آگے بڑھ گئی اور مہدی کو یقین نہ آیا کہ وہ اسکا یقین کر کے گئی تھی۔

☆☆☆☆☆

واپس ہاسٹل آ کر اسے یوں لگا تھا جیسے وہ ایک آدھ گھنٹہ نہیں بلکہ ایک صدی گزار کر آئی ہو۔ تھکے تھکے قدم لیتی وہ اپنے کمرے میں آ کر بیڈ پہ ڈھے سی گئی۔ سرخ جوڑے میں اسکی رنگت دمک رہی تھی۔ مگر کچھ تھا اس کے چہرے پہ زرد سا۔ تھکا تھکا سا۔ چند پل یونہی خالی الذہنی کے عالم میں پڑی رہی، آنکھیں بند کر لیں تو گویا جلن بڑھ گئی۔ اس نے سونے کی کوشش کی۔ ہاں ہر مسئلے کے دوران اسے بس سونا ہوتا تھا۔ بس نیند چاہئے ہوتی تھی۔ وہ غنودگی میں جانے لگی جب اسے اپنے قریب بے انتہا شور سنائی دیا۔ مندی مندی آنکھوں سے وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے سامنے مناہل تھی۔ جو بلند آواز میں رو رہی تھی۔ بے تحاشا رو رہی تھی۔ اس کے پلنگ پہ اسکا موبائل، لیپ ٹاپ، آئی پیڈ، پڑا تھا۔ اور سب کی سکرین تاریک تھیں۔ سیاہ۔ ہاسٹل کی آدھی لڑکیاں اس کے کمرے میں جمع تھیں اور روتی بلکتی غم سے پاگل ہوتی مناہل

کو سنبھال رہی تھیں۔ دس لاکھ کا نقصان تو کہیں نہیں گیا۔ دروازے پہ کھڑی شیزل اس سارے ہنگامے کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”میرا سارا ڈیٹا تھا اس میں، میری تصاویر میرے ڈاکومنٹ تھے“ وہ زور زور سے روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ زینیا بس اسے دیکھ رہی تھی۔ آنکھوں میں ملکہ بد والی مسکراہٹ تھی۔

”میں اب کیا کروں میں نے کئی لوگوں دکھایا ہے۔ لیکن کسی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا مسئلہ کیا ہے۔ یا اللہ میرا انسٹاگرام میری ای میل پہ بنا تھا اور مجھے میری میل بھی یاد نہیں۔ اوہ خدایا میرے دس لاکھ فالوورز“ اسے سانس نہیں آ رہا تھا۔ وہ اپنے سینے پہ ہاتھ مارنے لگی تھی۔ اسی لمحے شیزل کی نظریں زینیا حاکم کی نظروں سے ٹکرائیں۔ وہ سر نفی میں ہلا رہی ہو جیسے کہہ رہی ہو ”کہہ دو زینیا حاکم یہ تم نے نہیں کیا۔“

زینیا مسکرائی۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھالی۔ اور آنکھوں ہی آنکھوں میں گویا کہا ہو۔ ”کہا تھا ناں زینیا ایسے نہیں لڑتی۔“ شیزل سیمسن آنکھوں میں ڈھیر ساری حیرت لئے آگے بڑھ آئی۔ لڑکیوں کو دو چار دھکے دے کر راستہ بنایا۔ مناہل کے ماتم کو نظر انداز کیا اور زینیا کے ساتھ آکر بیٹھ گئی۔ ٹانگ پہ ٹانگ چڑھالی

- بلکل ویسے جیسے زینیا نے چڑھا رکھی تھی۔ کندھے اٹھے ہوئے، چہرہ سپاٹ، آنکھیں مسکراتی ہوئی۔ بلکل ایسے جیسے زینیا۔ میسٹریز یو نو۔

”مجھے تمہیں سمجھنے میں دیر ہوئی۔ لیکن یہ سارا ڈرامہ مجھے بے حد پسند آیا۔“ شیزل اس کے کان کے پاس جھکی۔ اور ایک بار پھر بلکل سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔

”میں نے داد قبول کی۔“ ملکہ فخر سے بولی۔

”ویسے مجھے تمہارا بدلہ کچھ خاص پسند نہیں آیا۔ مشینیں کبھی بھی ٹھیک ہو سکتی ہیں۔“

”زینیا کی کھولی ہوئی مشینوں کو زینیا خود بھی نہیں جوڑ سکتی۔“ فخر یہ مغرور انداز میں اس نے اپنے اٹھے

ہوئے کندھے مزید اٹھائے۔ شیزل اب بھی تیر کی طرح سیدھی بیٹھی سامنے ہونے والا تماشا دیکھ رہی تھی۔

”ویسے تم نے داد پانے، سرخرو ہونے کے لئے تو مجھے اپنا کارنامہ نہیں بتایا۔ یقیناً تمہیں بدلے میں کچھ چاہیے۔“

”آہ میں تمہاری ذہانت سے متاثر ہوئی ہوں۔ کاش میں تمہاری فین بن سکتی۔ ہاں بن سکتی تھی اگر میں اپنی سب سے بڑی فین نہ ہوتی۔“ زینیا کمال نزاکت سے بولی۔

شینزل نے اب کے مڑ کر اسے دیکھا۔ انکے پاس جھگڑا ہو رہا تھا۔ مناہل اب ایک لڑکی کو کوس رہی تھی الزام دے رہی تھی۔ اور یہ دو لڑکیاں تھیں، جن کو پرواہ نہیں تھی۔ لا پرواہی اور ڈھٹائی ہو تو ایسی۔

”میں تمہارے ساتھ مل کر اس عورت کو قتل نہیں کرنے والی۔ ہاں کر سکتی تھی لیکن میرا موڈ نہیں۔“ شان بے نیازی سے کندھے اچکائے۔

”اگر مجھے کسی کا قتل کرنا ہوتا تو کم از کم تمہیں ہائر نہ کرتی۔ تم ایک انتہائی بری قاتل بنو گی۔“ ساتھ ہاتھ اٹھا دیئے۔

"No offense".

”تمہیں کرنا بس یہ ہو گا کہ اس لڑکی کو میرے کمرے سے نکال کر خود کو یہاں فٹ کروانا ہو گا۔ ہاں تم بھی برداشت کے قابل نہیں ہو، لیکن تمہارے ساتھ کوشش کی جا سکتی ہے۔“

مناہل اب ساری تمیز بالائے طاق رکھ کر اونچی اونچی آواز میں گالیاں نکالنے لگی تھی۔ انعم اس کے بال نوچ رہی تھی۔ وہ دونوں آپس میں گتھم گتھا تھیں۔ لڑکیاں انہیں چھڑوا رہی تھیں۔ شور بڑھ رہا تھا۔ لیکن کسے پرواہ تھی۔

”شینزل سیمسن ایک تحفہ ہے جو ہر کسی کو نہیں ملتا۔“ وہ جتا گئی۔

”تم دنیا کا پہلا تحفہ ہو جس کا منہ ہر وقت چلتا ہے۔ اور پیٹ ہر وقت خالی۔ جیب تو روپے دیکھنے کے لئے ترسی ہوئی۔ اس لئے مس تحفہ، اگلے ایک ماہ تک ہر روز ایک کالڈ کافی میری طرف سے۔ اب میرے کمرے کو تمہاری آمد کا شرف مل سکتا ہے۔؟“ شینزل نے سر کو خم دیا اور مسکراتے ہوئے اٹھی۔ اسے ذمہ داری دی گئی تھی۔ اور ذمہ داریاں اس کے لئے کبھی مشکل نہ رہی تھیں۔ وہ لڑکیوں کے جھمگٹے میں گھس گئی۔ کچھ اس کے بال نوچے گئے، کچھ چانٹے پڑے لیکن بلاخر وہ ان دونوں کو چھڑوانے میں کامیاب رہی تھی۔

اگلے چند منٹ میں مناہل روتے ہوئے اپنا سامان باندھ رہی تھی۔ اور شینزل کو بار بار نم، ممنون آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ بار بار جی چاہتا تھا کہ اسے گلے سے لپٹا لے۔ اونہوں وہ no hugs رول پہ چلتی

تھی۔ چند ہی گھنٹوں میں کمرے کی حالت بدل چکی تھی۔ ایک ٹک ٹاکر وہاں سے رخصت ہو گئی تھی اور اب اسکی جگہ ایک انٹیریئر ڈیزائنر تھی۔

وہ دونوں ذرا ذرا سے فاصلے پہ اپنے اپنے پلنگ پہ لیٹی تھیں۔ کمرے کی صفائی کرتے ہوئے چہرہ دھول سے بھر گیا تھا۔ جسم تھکن سے چور تھے۔ ”تم نے اسے ایسا کیا کہا کہ وہ کمرہ چھوڑ دینے پہ راضی ہو گئی۔“

”میں نے اسے بتایا کہ زینیا حاکم ایک منحوس عورت ہے۔ وہ جہاں جاتی ہے وہاں بربادی ساتھ لاتی ہے۔ اب نین تارہ اور ہمارے ہاسٹل کو ہی دیکھ لو۔ اس کے آتے ہی کتنا بڑا ہنگامہ ہوا اور نین تارہ پکڑی گئی۔ اگلے دن تم کمرے میں آئیں۔ پہلے تمہارا بریک اپ ہوا اور اب یہ نقصان۔ بہتر ہے روم چینج کر لو۔“

زینیا سکون سے سن رہی تھی گویا یہ بات اس کے بارے میں تھی ہی نہیں۔ ”آگے سنو۔ وہ مجھ سے کہنے لگی کہ اگر کمرہ چینج کرنا پڑا تو بھلا میں کہاں جاؤں گی۔ اور کون اس نحوست کو اپنے سر لے گا۔ تب میں شیزل سیمسن نے اسکی سب سے بڑی ہمدرد ہونے کا کھیل کھیلا۔ اور نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ بس اب صبح میری کالڈ کافی تیار ملنی چاہیے۔“ وہ بولتے ساتھ کراہی۔ تھک گئی تھی بھئی وہ۔

”سیمسن چچا کو فون کرو اور منگوا لو اپنی کافی۔ زینیا اپنا پیسہ اپنے باپ پہ بھی خرچ نہیں کرتی۔“ وہ مکر گئی

تھی۔ بخدا وہ مکر گئی تھی۔ شیزل مارے صدمے کے اٹھ بیٹھی۔ ”تم نے معاہدہ کیا تھا زینم۔“

”اچھا واقعی۔؟ اور تمہیں لگا تھا میں اس معاہدے پہ قائم رہوں گی جس کا نہ کوئی ثبوت ہے نہ گواہ۔“

اس نے معصومیت سے آنکھیں پٹپٹائیں۔

”تم غلط انسان سے الجھ رہی ہو مس زینم۔ میں انتقام لوں گی۔“

”ہاں لے لینا۔ وہ جو میری زمینوں پہ تم پانی روک دو گی۔ میں دیکھ لوں گی۔“ (علاقائی دھمکی۔) شیزل

صدمے سے بیڈ پہ ڈھے گئی تھی۔ نیا کمرہ اسے سسرال لگ تھا۔ اور زینیا حاکم چڑیل ساس۔ اپنے کمرے

میں واپس جانا یوں تھا جیسے پسند کی شادی کے بعد کہنا ”لڑکا پسند نہیں آیا۔“

جو اس کے ساتھ ہوا تھا اس کے لئے اب صدمہ جائز تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ٹیکسلا ایک تاریخی شہر ہے۔ جہاں سیاحت کے لئے کئی سارے مقامات ہیں۔ خاموش اور پرسکون سا شہر

۔ جہاں تاریخ نے اپنے کئی راز چھوڑ رکھے تھے۔ کئی قلعے، بستیاں اور میوزیم ہیں جو ٹیکسلا کے حسن میں

اضافہ کئے ہوئے ہیں۔ اس وقت ہم ایک رہائشی بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے ایک خستہ حال فلیٹ میں آئیں گے۔ جہاں دیوار گیر کھڑکی سے کرسی لگائے بیٹھا بالاج میرا افسردہ تھا۔ اس کے پرکشش نقوش میں آج زردی گھلی ہوئی تھی۔ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے وہ آج گو اپ کر رہا تھا۔ مستقبل پہ؟ یا حال پہ۔ دونوں پہ۔ کیونکہ وہ ماضی کو چن رہا تھا۔ بالاج کا ماضی ایک انسان کا ماضی جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔

اس نے آنکھیں بند کیں۔ بے تحاشا جلن تھی جو اس کے سینے کو جلا رہی تھی۔ دفعتاً فرحان نامی اس کا دوست اس کے قریب آ کر بیٹھا۔ بازو اس کے کندھے پہ رکھا۔ وہ فکر مند تھا۔

”بالاج . . . میرے بھائی۔ انسان کو ان لوگوں پہ گو اپ نہیں کرنا چاہیے جنہوں نے برے وقت میں ساتھ دیا ہو۔ انکے لئے ہمیشہ کوشش کرنی چاہیے اپنی طرف سے ان کو کچھ اچھا دینے کی کوشش۔ تم سمجھ رہے ہونا۔ تمہاری بیوی بہت کچھ ڈیزرو کرتی ہے۔“

بالاج نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا اسکی آنکھیں رندھی ہوئی تھیں سرخ بے تحاشا سرخ۔

”مجھ پہ ذمہ داریوں کا بڑا بوجھ ہے۔“ وہ رنجیدگی سے بولا۔ ذہن دور کہیں ماضی میں بھٹک گیا۔

وہ دس سال کا تھا۔ جب ابا نے سارا پیسہ جوے میں اڑا دیا۔ اور اسکی بڑی بہن کا رشتہ قرض کے بدلے کہیں طے کر دیا۔ اسے یاد تھا کس طرح اس کے چچاؤں نے انہیں گھر سے نکالا تھا۔ اسے یاد تھا ان لوگوں کے پاس کھانے تک کے پیسے نہیں تھے۔ اسے یاد تھا کس طرح اس کی بہن اپنے شوہر سے پٹ کر آتی تھیں۔ جب وہ نشے کے لئے ان سے پیسے مانگا کرتا تھا۔ وہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر رویا کرتی تھیں۔ اور بالاج اسے دیکھتا رہتا تھا۔

ایک روز وہ سو کر اٹھا تو اسے صحن میں غیر معمولی شور سنائی دیا۔ مندی مندی آنکھیں لئے وہ جب صحن میں آیا تو اسے بے اختیار دیوار کا سہارا لینا پڑا۔ آنکھیں دھندلی ہو گئیں۔ وہ دھیرے دھیرے فرش پہ بیٹھتا چلا گیا۔ سامنے اس کی بہن کی لاش تھی۔ اس کا چہرہ سبز پڑ چکا تھا۔ بالاج کو یہی زہر اپنی رگوں میں اترتا محسوس ہوا۔ پاس کھڑی عورتیں کچھ کہہ رہی تھیں۔ ”اور بھلا کیا بہن۔ شوہر روز مار پیٹ کرتا، اور پیسے مانگتا تھا۔ کل رات بھی یہی ہوا۔ جب اس نے کہا پیسے نہیں ہیں تو کمبخت نے زہر ملا کر دے دیا۔ چار ماہ سے حاملہ تھی بیچاری۔ بڑی دردناک موت آئی ہے اللہ بچائے۔“

فرش سے لگے بالاج کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اس کے سامنے اسکی محبوب بہن کی لاش تھی۔ جس نے اس کے لئے ہمیشہ قربانیاں دی تھیں۔ ابا تو اسے جواری کی خدمت میں جھونک رہے تھے

- لیکن اس کی بہن اسکی saviour بن گئی۔ کیا ہوا اسے یاد نہیں تھا۔ کیا سنا سب بھول گیا۔ بس یاد تھا تو اتنا کہ اس کی بہن ”پیسی“ نہ ہونے کی وجہ سے مر گئی تھی۔

”ہر انسان کا خود پہ حق ہوتا ہے۔ لیکن ہر انسان پہ اس کا بھی حق ہوتا ہے جس نے ماضی میں آپ کے لئے efforts کی تھیں۔ جو آپ کو ایک برے فیز سے نکال لایا تھا۔ ہر انسان پہ ماضی کے کچھ قرض ہوتے ہیں۔ تم حال میں قرض دار ہو بالاج۔ اپنی بیوی کے۔ اس کے احسانات کے۔“ بالاج نے گردن نفی میں ہلائی۔ گیلی آنکھوں میں بے پناہ شکوے تھے۔

”میں اپنے ماضی میں بھی قرض دار رہ چکا ہوں۔ مجھے وہ قرض اتارنا ہے۔“

اسکی بہن کی موت کو چار ہفتے بیت چکے تھے۔ اماں غم سے نڈھال تھیں۔ ابا چند دن افسردہ رہے اور پھر وہی نشہ وہی جوا۔ ہاں البتہ انہوں نے پولیس میں رپورٹ ضرور کروا دی تھی۔ بالاج انکے ساتھ تھانے کے چکر لگاتا رہتا۔ اپنی بہن کے لئے انصاف مانگتا رہتا لیکن اگلی پارٹی تگڑی ہے۔ کہہ کر انھیں ٹال دیا جاتا۔ ابا البتہ ایسی کوئی کوشش نہیں دکھا رہے تھے۔

وہ گھنٹوں گھر میں پڑا سوچتا رہتا کہ اگر انکی بھی معاشرتی حیثیت ہوتی، روپیہ پیسہ ہوتا، تو انکی سنی جاتی۔ اس کی بہن کے تین بچے اور ایک مرچکی اولاد کو انصاف مل جاتا اسے پیسہ چاہیے تھا۔ ڈھیر سارا پیسہ۔ تاکہ اسکی باقی کی تین بہنوں کو کسی جواری کے پاس نہ جانا پڑے۔ تاکہ اسکے یتیم بھانجے ایک اچھی زندگی گزار سکیں۔ انہی دنوں ابانے "دیت" کی شرط رکھ دی۔ بالاج ان دنوں ٹوٹ کر رہ گیا تھا۔

اسکی بہن کا قتل دو لاکھ میں بیچا جا چکا تھا۔ اسکی ماؤں جیسی بہن۔ کیا اس کے بچے دو لاکھ ساری زندگی کھا سکیں گے۔؟ کیا یہ دو لکھ انکی پرورش کر سکیں گے۔ اسے نہیں معلوم تھا۔ اسے کچھ نہیں معلوم تھا سوائے اس کے کہ اسے بہت سارا پیسہ چاہیے معاشرے میں ایک مقام چاہیے۔ وہ اپنی بہن کے بچوں کو دیکھتا تو دل کڑھتا تھا۔ وہ بچوں کو ویسی زندگی نہیں دے پا رہا تھا جیسی انہیں ملنی چاہیے تھی۔ پھر چند روز بعد یہ جلن، یہ کڑھنا ختم ہو گیا۔

بچوں کا باپ اپنی غمزدہ گردی اور طاقت کے بل پہ اپنے تینوں بچوں کو لے جا چکا تھا۔ بالاج اس وقت سولہ سال کا تھا۔ اس نے وکیل کرنا چاہا، کیس لڑنا چاہا۔ مگر بے سود۔ سیاہ لباس والی وکیل نے اول تو اس کی کم مائیگی کی وجہ سے کیس نہ لیا۔ دوئم اسے خبر دار کیا کہ انکی معاشی حالت اس قدر بری ہے کہ عدالت چاہ کر بھی انھیں کسٹڈی نہیں دے سکتی۔ اسکی بہن کا قاتل جیل سے بچ گیا۔ کیونکہ ان کے پاس

پیسے نہیں تھے۔ وہ طاقت کے بل پہ بچوں کو لے گیا کیونکہ بالاج کے پاس پیسے نہیں تھے وکیل کیس نہیں لڑتا تھا، عدالت کسٹڈی نہیں دیتی تھی۔ کیونکہ اس کے پاس پیسے نہیں تھے۔

اسے مستقبل میں مضبوط بننا تھا۔ حیثیت بنانی تھی۔ اور اور بس پیسہ کمانا تھا۔

”اپنے ماضی کو بھول جانے والے انسان کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ وہ چاہے جتنا آگے نکل جائے قدرت اسے کھینچ کر اسکوائر ون پہ لے آتی ہے۔ نیکی، وفا، ایثار کو بھلا دینے والا انسان کہیں کا نہیں رہتا۔ ایسا انسان ظالم ہوتا ہے اپنے ساتھ بھی، وقت کے ساتھ بھی اور اپنے مسیحا کے ساتھ بھی۔ کیا کوئی مسیحا یہ ڈیزرو کرتا ہے۔؟“ فرحان اسے سمجھا رہا تھا۔ کسی اور عورت کے متعلق اور وہ سمجھ رہا تھا کسی اور عورت کے متعلق۔

”قدرت کے فیصلے میں دیر ہے۔ اس وقت میری قسمت کا فیصلہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اور میں بالاج میر اپنی قسمت کا فیصلہ کر چکا ہوں۔ حال میں میرا مسیحا کوئی بھی، میں ماضی کی اس saviour کو نہیں بھول سکا۔“

چند سال بعد اسے جو خبر ملی تھی وہ اسکی دنیا کو تہہ و بالا کر گئی تھی۔ ہسپتال کے سرد خانے میں وہ بکھری حالت میں کھڑا تھا۔ اس کے دو معصوم بھانجے آج وہ انہیں پانچ سال بعد دیکھ رہا تھا۔ زندہ نہیں مردہ۔ ساکن بے سانس، سرد۔

اس کے چہرے پہ آنکھوں سے گرتا ہوا پانی تھا۔ یہ لاشیں دیکھ کر نہیں آیا تھا۔ یہ ان لاشوں کے ادھڑے جسم دیکھ کر اٹھ آیا تھا۔ بچوں کے گردے نکالے گئے تھے۔ انکی آنکھیں سرے سے غائب تھیں۔ اور جسم جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ بالاج میر کو سخت سردی لگنے لگی۔ پھر سخت گرمی۔ پھر رونا آیا، پھر غصہ اور پھر بے بسی۔ اسکی بہن کا قاتل اور ان بچوں کے باپ نے کسی سے دشمنی مول لے لی تھی۔ اور وہ لوگ خطرناک تھے اتنے کہ کسی کا جسم چیر دیتے اور سوچتے نہ تھے۔ اس نے لاکھ کوشش کی، اس نے لاکھ چاہا کہ وہ ان ادھڑے ہوئے جسموں کا بدلہ لے سکے لیکن ان دونوں بچوں کا بڑا بھائی، جو اس سرد خانے کے باہر بیٹھا تھا۔ اس کے تاثرات سپاٹ تھے۔ بالاج نم ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا پھر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ شکستگی سے۔ ہار مان کر۔ ”مجھے معاف کرنا۔ میں تم لوگوں کو بچا نہیں سکا۔ میں نے کوشش کی تھی۔ بہت کی لیکن“ وہ رکا۔ گلا دکھ رہا تھا۔ سانس اٹک رہا تھا۔ ”مجھے معاف کرنا۔ ہم انتقام لیں گے۔ میں“

”بس کر دیں یار۔“ بچہ بے بسی سے چلایا۔ ”میری ماں مر گئی آپ نے تب بھی یہی کہا۔ ہماری کسٹڈی ہمارے باپ کو مل گئی آپ نے تب بھی یہی کہا تھا۔ اور آپ اب بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ تھک گیا ہوں آپ پہ یقین کر کر کے۔ بخش دیں ہمیں۔ انتقام وہ لوگ لیتے ہیں جتنکی کوئی حیثیت ہو، معاشرے میں جن کا مقام ہو، جن کے پاس پیسہ ہو۔ اور آپ۔“ وہ غرایا۔ ”آپ کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ بخش دیں ہمیں۔ منت واراں، سرکار منت واراں۔ (شکریہ سرکار شکریہ۔)“

اس روز بالاج یوسف میر نے خود سے ایک عہد کیا تھا کہ وہ اپنے باپ جیسا نہیں بنے گا۔ اپنی بہنوں کو ایک برے شوہر سے بچائے گا۔ اور اگر کوئی برا شوہر کوئی برا حادثہ انکی زندگی کا حصہ بن بھی گیا تو وہ اتنا پیسہ کمائے گا کہ عدلیہ، قانون اسے انصاف دینے پہ مجبور ہو جائیں۔

پیسہ بالاج میر کو حل لگتا تھا۔ ہر قسم کے مسائل کا حل۔ وہ کمائے گا اسکے لئے جو مرضی کرنا پڑا کر جائے گا اور وہ کر رہا تھا۔

چند گھنٹے بعد۔۔

وہ الماری کے سامنے کھڑا تھا۔ فون کان اور کندھے کے درمیان اٹکا رکھا تھا۔ چہرہ سنجیدہ تھا۔ سفید رنگ کا جوڑا نکالتے ہوئے اسکی سماعتوں سے ایک مانوس آواز ٹکرائی۔

”کیا میں یہ مان لوں کہ آپ مجھے مس کر رہے ہیں۔“ زینیا مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔ بالاج نے تھکن سے آنکھیں بند کر لیں۔

”تم جانتی ہو میں تم سے کتنی محبت کرتا ہوں۔؟“ دوسری طرف خاموشی چھا گئی مگر وہ بول رہا تھا۔ ”تم بہت اعلیٰ تھیں زینیا ہمیشہ سے بہت اونچی۔ میں بس تمہیں دیکھ سکتا تھا، تمہاری خواہش کر سکتا تھا۔ تم میری ہو سکتی ہو یہ تو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ یہاں تک میرے خیالوں کو بھی رسائی نہیں تھی۔“ وہ ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا۔ زینیا اسے سنتی گئی۔

”پھر ایک دن تم مجھے مل گئیں۔ اور میرے لئے دنیا مکمل ہو گئی۔ نعمتوں کی کوئی حد نہ رہی۔ میں بس تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بالاج اگر مر بھی گیا تو اسکی آنکھوں کے آخری منظر تمہارا ہو گا۔ میں تم سے بہت محبت کرتا ہوں، ہمیشہ سے۔“ زینیا نہیں جانتی تھی کیوں مگر اسے یہ الفاظ سکون دے رہے تھے۔

”میرے دل میں تمہارا ایک مقام ہے۔ ہمیشہ تمہارا رہے گا۔ آج میں اپنے ماضی کے زیر اثر کچھ کر رہا

ہوں۔ شاید یہ سب کبھی مستقبل میں تمہارے لئے تکلیف دہ ہو۔ لیکن مجھے یقین ہے تمہارے پاس مسائل سے پہلے حل ہوں گے۔“

”یاد رکھیے گا زینیا مر جاتی ہے معاف نہیں کرتی۔“ بالاج زور سے ہنس پڑا۔

”کتنا مشکل ہے ناں تم سے دل کی بات کہنا۔“ یوں کہا جیسے وہ ہرٹ ہوا ہو۔ ”بہت جھجھینٹل ہو تم۔“ زینیا نے گہری سانس لی۔

”ایسا کوئی انسان آج تک بنا ہی نہیں جو جج نہ کرتا ہو۔ ہر انسان جج کرتا ہے۔ کبھی منہ پہ کبھی پیچھے۔ بس زینیا بری اس لئے ہے کہ وہ باتیں منہ پہ مار دیتی ہے۔“ بالاج کئی لمحے خاموش رہا۔ پھر کال کاٹ دی۔ عجیب بے کلی سی سر پہ سوار ہونے لگی تھی۔ کچھ وقت بعد وہ ایک کاغذ پہ سائن کر رہا تھا۔ بالاج میر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆

زینیا حاکم ایک پرائیویٹ ایجنسی میں انٹرویو دینے آئی تھی۔ یہ ایجنسی شادی بیاہ، سالگرہ، اور دیگر تقریبات کے لئے پروفیشنل فوٹو گرافی کرتی تھی۔ اپنے کوائف وہ ایک ہفتہ قبل بھیج چکی تھی۔ ساتھ ساتھ

کچھ تصاویر بھی ای میل کر دی تھیں۔ آج اسے ایک کال آئی تھی۔ اور اب وہ صبح سے یہیں اس عمارت میں خوار ہو رہی تھی۔ بالاج کی کال ابھی ابھی بند ہوئی تھی۔ دوسری منزل کی راہداری میں بیچ پہ بیٹھی زینیا حاکم نے فون کان سے اتارا تو وہ پریشان لگ رہی تھی۔ اسکی رنگت اڑی ہوئی تھی۔ دل کو بے اختیار کوئی جکڑنے لگا۔ کچھ برا کچھ بہت برا ہونے کا عندیہ اسے مل چکا تھا۔ وہ اگر کہتی تھی اسے دھوکہ نہیں وجدان ملا کرتا ہے تو شاید غلط نہیں تھی۔ سر ہاتھوں میں گرائے کئی پل وہ بے دھم سی بیٹھی رہی۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ آس پاس بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ اعلیٰ لوگ، اونچے عہدہ دار، شاہی لباس میں ملبوس لوگ۔ زینیا کو اس وقت کسی سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ یکدم اسے بوٹوں کی چاپ اپنے قریب محسوس ہوئی۔ پھر وہ چاپ رک گئی۔ اسکی چھٹی حس نے محسوس کیا کہ کوئی اس کے سامنے رک گیا ہے۔ اس نے سر اٹھایا۔ سیاہ ڈریس شرٹ کے ساتھ دھاری دار پینٹ میں ملبوس گھنگھریالے بالوں والا شخص آنکھوں پہ گلاسز لگائے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ کوٹ بازو پہ لٹکا رکھا تھا۔

”تمہیں یہاں دیکھ کر بالکل اچھا نہیں لگا۔“ وہ گلاسز اتارتے ہوئے محظوظ سا بولا۔

”خیال میرا بھی کوئی مختلف نہیں ہے۔“ وہ تھکی ہوئی تھی۔ مگر جواب نہ دیتی تو زینیا کیسے کہلاتی۔ قیس نے

اشارے سے اپنی ٹیم کو جانے کا کہا۔

”تم کہتی ہو تم سی ایس ایس کی تیاری کر رہی ہو، لینگویج کلاسز لے رہی ہو۔ اور یہاں نوکری لینے بھی آئی ہو۔ میں تمہاری کس بات پہ یقین کروں۔“

”میں جہاں جہاں جاتی ہوں، تم وہاں وہاں آجاتے ہو۔ پھر کہتے ہو میں اتنی خوبصورت نہیں ہوں کہ کوئی پہلی نظر میں مجھ سے محبت کر لے۔ میں تمہاری کس بات پہ یقین کروں۔“ قیس نے بے اختیار آس پاس دیکھا تھا۔ وہ کتنی blunt تھی۔

”میں یہاں اپنے کام ”قیسم“ کی وجہ سے آیا ہوں۔“

”ایک فیشن ڈیزائنر کا فوٹو گراف ایجنسی میں کیا کام۔؟“

”صرف ایک فیشن ڈیزائنر ہوتا تو کوئی کام نہ ہوتا ہاں البتہ ایک سی ای او کو یہاں بہت سارا کام ہو سکتا ہے۔ ویٹ تمہیں کیسے پتہ میں کیا کرتا ہوں۔؟“ راہداری میں گزرتے لوگوں سے بے پرواہ وہ دونوں ایک دوسرے کی جرح پہ اتر آئے تھے۔

”بس پتہ چل جاتا ہے۔“ وہ شان سے بولی قیس محظوظ ہوا اور اس کے ساتھ بیٹج پہ بیٹھ گیا۔

”کبھی پارک میں میری تصاویر لیتی ہو، کبھی میرے گھر میں گھس جاتی ہو، اور کبھی میرے بارے میں تفصیلات لیتی پھرتی ہو۔ اور پھر تم کہتی ہو تم صرف ایک فوٹو گرافر ہو اسٹالکر نہیں۔“

”کبھی میری گردن پہ بندوق رکھ دیتے ہو، کبھی مجھے اپنے گھر میں پناہ دے دیتے ہو، اور کبھی پارک میں مجھے تسلی دیتے ہو، پھر ایک ایجنسی میں مجھے دیکھ کر رک جاتے ہو۔ اور پھر کہتے ہو مجھے دیکھ کر تمہیں اچھا نہیں لگا۔ میں تمہاری کس کس بات کا یقین کروں۔“ وہ ایسی معصومیت سے بولی کہ قیس کو اٹھنا ہی پڑا۔ ایسی blunt لڑکی سے کیا بات کرنا۔ وہ جانے کو مڑا پھر جاتے جاتے رکا۔

”یو نو واٹ میری ہی غلطی تھی جو یہاں رک گیا۔ مجھے لگا تھا تم پریشان ہو“

”پریشان تو میں ہوں۔ اور مسائل زدہ بھی۔“ اس نے قیس کی بات درمیان میں اچک لی۔

”اور اگر تمہیں لگتا ہے میں تمہاری مدد کروں گا تو تم غلط ہو ہے ناں۔؟“ وہ استہزائیہ سا ہنسا۔ زینیا نہیں

ہنسی بس تھکی تھکی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔ اب کے قیس کو تشویش لاحق ہوئی۔ وہ آگے بڑھ آیا۔

”کیا وہ لوگ تمہیں دوبارہ کالز کر رہے ہیں۔ کیا وہ تمہارے پیچھے آئے ہیں۔؟“ وہ اسکے قریب بیٹھا راز

داری سے پوچھ رہا تھا۔

”تم نے انھیں کیسے ڈیل کیا۔؟“ زینیا نے بات پلٹ دی۔

”میرے اپنے سوز سز ہیں۔ (اسکی آنکھوں کے آگے ماہ جبین کی شبیہ لہرائی۔) میں بات کو دفن کرنا جانتا

ہوں۔ دشمنی بڑھائی نہیں۔ میں جھک گیا۔ ان کو دگنی رقم ادا کی۔ اور تمہارا نام ہمیشہ کے لئے نکال دیا۔“

”تم نے ایسا کیوں کیا۔ تم جھکنے والوں میں سے نہیں لگتے۔“ زینیا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

”ہم علاقائی لوگ ہیں۔ روایت نہیں جانتی تم۔؟ گھر میں آنے والوں کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہوتی ہے

۔ دوسرا میں ہرگز نہ جھکتا اگر معاملہ میرا ہوتا، لیکن یہاں مجھے یہی مناسب لگا میں چاہتا تھا تم سکون سے

رہو۔ اس شہر سے جو لینے آئی ہو وہ لے کر جاؤ۔ کامیابی، عزت، سب کچھ۔“ وہ ایک پل کو رکا۔ ”پریشان

ہونے کو اگر اس کے علاوہ کوئی مسئلہ ہے تو ہوتی رہو۔“

وہ کہہ کر اٹھ گیا۔ زینیا نے سر ایک بار پھر ہاتھوں میں گرا لیا۔ اسی پل اسکا فون بجنے لگا تھا۔ اس نے کال

اٹینڈ کر لی۔ آواز بیٹھی ہوئی لگتی تھی۔

”اگر آپ کو فرصت مل جائے تو گھر تشریف لے آئیں۔ یہ ہاسٹل افروزہ بیگم کا ہے۔ تمہارے چچا سیمسن، یا پھر حاکم صاحب کا نہیں۔“ وہ سخت پتی ہوئی تھی۔ زینیا خاموش رہی۔ وہ بھی تھک چکی تھی حالت سے، پریشانیوں سے۔

”ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔ دماغ چلاؤ اور حل نکالو۔“

”زہے نصیب، آپ ہمیں کام بھی کہتی ہیں۔ اچھا بتاؤ کیا ہوا ہے۔؟“

”میری ایک سہیلی ہے۔ اسکے شوہر کو جاب سے نکال دیا ہے۔“

”سہیلی کا شوہر؟ یا تمہارا شوہر۔؟ اچھا سمجھ گئی تمہارے شوہر کو جاب سے نکال دیا اب آگے۔؟“ وہ

سنجیدہ تھی۔ بے حد سنجیدہ۔ زینیا تپ گئی۔ مگر کہنا نہ چھوڑا۔

”سعودی عرب میں آپ کاروبار نہیں کر سکتے آپ کو ایک کفیل چاہیے ہوتا ہے۔ میرے شوہر کا کفیل

اس سے کچھ رقم کا تقاضہ کر رہا ہے۔ سب ٹھیک تھا۔ ہمارے پاس دس لاکھ تھے۔ میں چاہتی تھی وہ ان

دس لاکھ سے کوئی چھوٹا کاروبار یہیں شروع کر دے لیکن۔“ زینیا نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا راہ

داریاں خالی ہونے لگی تھی۔ وہ غور سے اسکی بات سن رہی تھی۔

”تمہارا شوہر وہ دس لاکھ ختم کر چکا ہے، ہے ناں۔؟ اور تم ان پیسوں کے متعلق بات نہیں کرنا چاہتیں

کیونکہ ہر مشرقی مرد کی طرح وہ آپے سے باہر ہو جائے گا۔؟“ زینیا نے بس اثبات میں سر ہلادیا۔

”وہ یہاں نہیں رہنا چاہتا اور باہر جانے کے لئے اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ اس نے مجھے ابھی کال کی

ہے۔ وہ غلط کاموں میں پھنس رہا ہے۔ میں نے اسے ایک ٹریول ایجنٹ سے بات کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ

غیر قانونی طریقے سے کسی اور ملک جا رہا ہے۔ میں اسے اس طرح برباد ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی۔“

”کیا تم اس سے محبت کرتی ہو۔؟“ اس سوال پہ زینیا سوچ میں پڑ گئی۔ دل کو ٹٹولا نہیں محبت تو اسے

عبداللہ سے بھی نہ رہی تھی۔

”کیا کسی کی فکر کرنے کے لئے اس سے محبت کرنا ضروری ہے۔؟“ دوسری طرف چند لمحہ خاموشی چھا گئی

”تم اسکی مدد کر سکتی ہو۔ تمہیں کرنی چاہئے۔“

”میں . . . بھلا میں کیا کر سکتی ہوں۔“

”ہر عورت کے پاس تھوڑا بہت زیور ہوتا ہے زینم۔ تمہارے پاس تو پھر بھر بھر کر سونا ہے۔“ زینیا کے گویا دل پہ گھونسہ پڑا تھا۔ زیور اسکا سونا، اسکی ہس زینیا تو اپنا نقلی زیور بھی سانجھ سانجھ کر رکھتی تھی۔

”اپنا زیور بیچ کر اسے پیسہ دے دو۔ اور یاد رکھنا پیسے ہی دینا کیونکہ وہ زیور لینا پسند نہیں کرے گا۔ پیسوں کو انکار کرنا مشکل ہوگا۔“ زینیا کئی لمحے کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ وہ شل رہ گئی تھی۔ یہ کام

یہ قربانی کیسے دے سکتی تھی۔ دے دیتی اگر شاید سامنے عبداللہ ہوتا۔ کیا وہ اس شخص کے لئے اپنا دل بڑا کر سکتی تھی۔؟ ”کیا ہوا زینیا حاکم۔ کیا سونے سے بہت زیادہ محبت ہے۔؟“

”کون سی عورت کو سونے سے محبت نہیں ہوتی۔“ بدلے میں وہ تلخی سے بولی۔ پھر فون کاٹ دیا۔ اور عمارت سے باہر نکل آئی۔ یہ ایک مصروف شاہراہ تھی۔ کئی اونچی اونچی بیلڈنگز سڑک کے سینے پہ کھڑی تھیں۔ زینیا سڑک کے کنارے چل رہی تھی۔ قریب ہی بس اسٹینڈ تھا۔ اس کے لئے فیصلہ لینا مشکل تھا مگر . . . اس نے آنکھیں بند کیں۔ اس کی آنکھوں کے آگے وہ بالاج تھا جو یونیورسٹی کے باہر اس کے ہاتھ پکڑے ہوئے رو رہا تھا۔ زینیا نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں۔ اسے تکلیف ہوئی تھی۔

ایک بار پھر آنکھیں بند کیں۔ اس منظر میں وہ بالاج کو کچھ رقم دے رہی تھی۔ اور وہ پہلے متفکر ہوا۔ پھر اسے برا لگا۔ اور پھر وہ زینیا کو تشکر سے دیکھ رہا تھا۔ اگلے لمحے محبت سے۔ پھر وہ ڈھیر سارا مسکرایا۔ زینیا بند آنکھوں کے ساتھ مسکرائی۔ فیصلہ ہو چکا تھا۔ وہ اسے خوش دیکھنا چاہتی تھی۔ بس خوش۔

”تمہیں لگا تھا تم مجھے دھوکہ دے سکتی ہو زینیا حاکم۔؟“ ایک سرد سی آواز پہ اس نے مڑ کر دیکھا۔ اسی لمحے بجلی زور سے کڑکی۔ ”تمہیں لگا تھا تم ہاسٹل کے باہر، کھڑے قیس کو بے وقوف بنا سکتی ہو۔ تمہیں کیا لگا تھا میں نے اس فرضی داستان پہ یقین کر لیا تھا۔؟“ آسمان سے کڑکتی بجلی کی روشنی میں اسے وہ لمحہ بھر کو نظر آیا۔ اسکی آنکھوں میں سفاکی تھی۔ وہ سالم موت تھا۔ زینیا کو اپنی سانس رکتا محسوس ہوا۔ بارش یکدم برسنے لگی تھی۔

”میں اس روز بھی مشکوک تھا۔ میں اس روز بھی تم پہ ایمان۔ نہیں لایا تھا۔ لیکن آج۔.....“ وہ آگے آیا۔ عین اس کے سامنے۔ ”تمہارا بھید کھل چکا ہے زینیا حاکم۔ کیا اب کوئی تمہیں میرے عتاب سے بچا سکتا ہے۔؟“ وہ آنکھوں میں سرد تاثر لئے اسے دیکھ رہا تھا۔ زینیا سن رہ گئی۔ بارش نے ان دونوں کو مکمل بھیکا دیا تھا۔ ”کیا تمہارے پاس اپنی صفائی میں کہنے کو کچھ ہے۔؟“ اس کی آواز میں تلواروں جیسی کاٹ تھی۔ زینیا اب بھی ساکن تھی۔

اسکا بھید کھل چکا تھا۔ کیا کوئی تھا جو اسے قیس کے عتاب سے بچالے۔؟

حباری ہے۔۔۔ اگلی قسط اگلے ماہ انشاء اللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔۔۔

اَلسَّلَامُ عَلَیْكُمْ اَحِبَّابُ۔۔۔

ناولز کی دنیا کے ناولز میں خوش آمدید۔۔۔۔

ناولز کی دنیا "ویب سائٹ / گروپ / پیج" دے رہا ہے تمام لکھاریوں کو ایک ایسا پلیٹ فارم جہاں آپ اپنی خدا داد صلاحیتوں کو اپنے قلم سے تحریر کر کے اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکتے ہیں۔۔۔ اگر آپ کو بھی اللہ کی طرف سے یہ صلاحیت دی گئی ہے تو اسے اجاگر ضرور کریں۔۔۔ ہمیں آپ جیسے ہی لکھاریوں کی تلاش اور ضرورت ہے۔۔۔

اگر آپ ہمارے بلاگز پر اپنا ناول، ناولٹ، افسانہ، کالم، آرٹیکل پوسٹ کروانا چاہتے ہیں تو ہم سے رابطہ کریں۔۔۔ اپنی تحریر اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیجیں۔ جتنا جلدی ہو سکا آپ کی تحریر پوسٹ ہو جائے گی۔۔۔

مزید تفصیلات یا کسی بھی طرح کی مدد کے لیے ہم سے گروپ یا پیج انباکس میں رابطہ کریں یا ای میل پر ہم سے رابطہ کر سکتے ہیں۔۔۔

Email address :- Novelskiduniya77@gmail.com

Facebook page :- [Novels ki duniya](#)

(user name [@zoyatalib77](#))

Facebook group :- [Novels ki duniya](#)

Instagram Page:- [Zoya Talib](#) (UserName: [Novelskiduniya77](#))

(پر خیال رہے کہ یہ گروپ زویا طالب کا ہی ہو)

اور باقی کے رابطے کے لیے ہر پیج کے نیچے **Blue** الفاظ میں لکھے لفظ میں آپکو لنکس مل جائے گے ان سب کے۔۔

لکھا ہے ان دونوں کو وزٹ کرنے کے لیے لکھے ہوئے پر ہی کلک کریں اور اوپن کر لیں۔۔۔

شکریہ۔۔۔۔۔

ناولز کی دُنیا



206

Novels Ki Duniya